1515

ادب پارے

ضیاء الاسلام
پی، سی، ایس
مصنف "دامِ خیال" و
"گلمسنز آف ماڈرن اردو لٹریچر"

طبع اوّل مئی ۱۹۴۵ء

تعداد اشاعت

ایکہزار

ہندوستانی پبلشرز دلّی

مطبوعہ مشن پریس الہ آباد

قیمت عمر

سرور کے نام

میرے نطق و فکر کی رعنائیاں، رنگینیاں،
تیرے الطاف و محبت پر نثار۔

ترتیب

صفحہ



مصنف مائکروفون پر
(سلہوٹ)

پیش لفظ

اس مختصر مجموعہ میں چند ایسے مضامین بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو یکجا کر دئے گئے ہیں جو میں نے دہلی اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشنوں سے مختلف موقعوں پر نشر کئے۔ اقبال پر جو مضمون اس مجموعہ میں شامل ہے وہ دہلی ریڈیو اسٹیشن نے رکارڈ کر کے یوم اقبال کے موقع پر ایک خاص پروگرام کے ساتھ نشر کیا تھا، جو مضمون اصغر گونڈوی پر ہے وہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے یوم اصغر پر نشر ہوا تھا، جگر مرادآبادی والا مضمون بھی عصر شعرا کے سلسلہ میں لکھنؤ ہی سے نشر ہوا تھا۔ اس مجموعہ کے بارہ مضامین تنقیدی ہیں جن میں سے دس ریڈیو پر نشر کئے گئے تھے۔ عمر خیام پر جو فیچر نظم میں ہے وہ دہلی سے مع ساز براڈکاسٹ کیا گیا تھا۔ صرف ایک مضمون ایسا ہے جو تنقیدی نہیں ہے یعنی "تعلیم دیہات" لیکن اسکو بھی شائع کرنا اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے، اس وقت بھی اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ جنگ کے ختم ہو جانیکے فوراً بعد اگر عام تعلیم دیہات میں رائج نہ کی گئی تو ملک کی ترقی صحیح راہ پر نہ ہو سکیگی تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات کو سمجھنے سمجھانے کے لئے عوام کو بھی تعلیم دینا ضروری ہے ورنہ اصغر ہوں یا جگر، نظیر ہوں یا اقبال سب ایک طبقہ کے شاعر بن کر رہ جاتے ہیں، عوام کے شاعر نہیں بن سکتے۔

امید ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے حضرات اس مجموعہ کو ناپسند نہ فرمائیں گے۔

ضیاء الاسلام

۱۱۱ - اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد
یکم مئی ۱۹۴۵ء

اقبال کے کنائے

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

اقبال کے پیام نے دل و دماغ کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ اس کے آرٹ کی طرف بھول کر بھی نظر نہیں جاتی۔ حالانکہ اقبال کی عظمت کا دار و مدار فلسفہ اور پیغام عمل سے کہیں زیادہ محاسن شعری پر ہے۔ بحیثیت صناع و لفظ تراش ہمارے اساتذہ میں اقبال کا کوئی حریف نہیں۔ ان کی اولیات کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں بحث ایک ایسے وصف سے ہے جو اقبال سے پہلے بھی اردو شاعری میں موجود تھا یعنی علامتوں کا استعمال ـ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

---

* اس مضمون کا بیشتر حصہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ریکارڈ ہو کر نشر کیا جا چکا ہے۔ یہاں لفظی ترمیم کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

غالب کے ان مشہور اشعار سے ہماری کلاسیکل شاعری کی اس خصوصیت کی توصیف بھی ہو جاتی ہے اور تجدید بھی۔ علائم سے یہی دو کام لئے جاتے ہیں۔ یعنی مشاہدۂ حق کی گفتگو اور ناز و غمزہ کا بیان۔ یا دوسرے الفاظ میں تصوف اور تغزل۔ تغزل میں علائم کے پردے میں محبوب کے خد و خال اور جور و ستم کا تذکرہ ہوتا ہے مثلاً محبوب کے لئے سرو، شمشاد، قاتل، اس ہی قسم اور الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور اس کی اداؤں کے لئے تیر و سنان، دشنہ، خنجر وغیرہ۔ تصوف میں محبوب حقیقی کا ذکر معشوق مجازی کے اوصاف کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً رخ، زلف نقاب، وصل و فراق، غمزہ و ناز سے روحانی کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

جس طرح استعارات کثرتِ استعمال سے اپنی خصوصیت کھو بیٹھے ہیں اور محاورات میں ضم ہو جاتے ہیں بعینہٖ اسی طرح علامتیں جب نادانستہ طور پر اور بغیر امتیاز رسماً استعمال کی جاتی ہیں، تو بجائے ادائے مطلب میں معاون ہونے کے وہ مضمون کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ ہماری غزلوں کی تعداد پکار پکار کر یہی گا رہی ہے۔ اقبال نے پرانی علامتوں کو نئے مضامین کے اظہار کے لئے آلۂ کار بنایا ان کے مردہ قالبوں میں دوبارہ جان ڈالی۔ اور پرانی میناؤں میں نئی شراب بھر دی۔ اقبال کی یہ اصلاح ورڈس ورتھ کی مشہور اصلاح سے کم نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ہمارا مصلح انگریزی شاعری کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہا ورڈس ورتھ

نے اس رسمی اور مصنوعی زبان کو یک قلم ترک کردیا تھا جو ڈرائیڈن، پوپ اور انکے اسکول کا طرۂ امتیاز تھی۔ اقبال نے اس سے زیادہ دشوار مگر صحیح راستہ اختیار کیا اس لئے اپنے پیشروؤں کی زبان خصوصاً ان کی علامتوں کو رسمیت اور تصنع کی زنجیروں سے آزاد کیا اور ان سے عشق و تصوف کے مضامین کے علاوہ نئے نئے خیالات و افکار ہم تک پہونچائے۔ انفرادی احساسات اور انفرادی جذبات کے بجائے پرانی علامتوں نے اجتماعی تصورات اور قومی و ملّی افکار و تخیلات سے رسم و راہ پیدا کی۔ شراب کہنہ تو لطف دیتی ہے۔ لیکن اس کے ذکر کا طرز کہنہ ہو تو طبیعت اسے قبول نہیں کرتی۔ ہمارے شعرا کی شراب آتش سیال نہیں رہی تھی۔ بلکہ گندلا پانی بن گئی تھی۔ اقبال نے اسے اور اسکے لوازمات کو زندہ کردیا ؎

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

اور

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

شراب، جام، ساقی، نشہ، محفل ان بوسیدہ علامتوں کے کوزہ میں اس نے ایک دریا بند کردیا۔ ان تنگناؤں کو اس نے کائنات کی وسعت عطا کی۔ ان نگوں کو تراش کر اس نے ان کو ہشت پہلو بنا دیا، اور ہر پہلو کو ایک نئے مفہوم کا حامل۔ احیا اور تجدید کی یہ لہر تم وساغر سے نکل کر خنجر کی آب، تلوار کی باڑھ اور تسبیل کی

تڑپ میں جلوہ گر ہوئی۔ مختصر یہ کہ کوئی پرانی علامت یا نقش ایسا نہ ملیگا جسے اقبال نے نئے مفہوم میں استعمال نہ کیا ہو۔ مثال کے طور پر "شمع و شاعر" کے اس بند کو لیجئے ۔

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

اس میں عاشق و معشوق، مے و میخوار، بسمل و قاتل، شمع و پروانہ، گل و بلبل ان تمام کلاسیکل علامتوں کے تار پود سے شاعر نے قومی و سیاسی افکار کے لئے ایک نئی قبا تیار کی ہے۔ وہ الفاظ جن سے لوریاں دی جاتی تھیں اب رجز میں استعمال ہونے لگے۔ وہ الفاظ جو دل شکستہ عاشق استعمال کرتے تھے، اب ملک و قوم کے فدائیوں کی زبان پر رقص کرتے ہیں۔ یہ اقبال کا سب سے بڑا فنی کارنامہ ہے اور کسی دوسرے ادب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

لیکن اقبال کی صناعی تجدید و احیا پر ہی ختم ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ اس نے ایجاد و اختراع کے مراحل بھی طے کئے۔ ذیل کی علامتوں میں زندگی تیزی کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ وہ نقوش زیادہ بلیغ اور پُر اثر ہوتے ہیں جو متحرک ہوں مثلاً شاہین و عقاب، بال و پر، موج و طوفان، شعاع و شبنم، کاروان و درا، رحیل و سفر، ستیز، وحشم، سیارہ و سیماب، گردوں، گرداں، مہر و ماہ وغیرہ۔

کسی ایسے شخص کو جو اقبال کی شاعری سے واقف نہ ہو اگر صرف یہ بتلایا جائے کہ یہ الفاظ اقبال کے کلام میں باربار استعمال ہوتے ہیں تو وہ ان کے نقوش سے شاعر کے کلام کا مطالعہ کئے بغیر اس کے پیام شخصیت اور فلسفہ کا اندازہ بخوبی کرلیگا شاعری میں علائم کا کیا مقام ہے، ان میں شاعر کے ارادہ کو کہاں تک دخل ہے ان سے شعر میں کیا اضافہ ہوتا ہے، ادبی روایات میں انکا کہاں تک جواز ملتا ہے یہ تمام مسائل ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، لیکن ہم ان پر صرف ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔

شاعر کا تخیل تصاویر کے بازوؤں پر اڑتا ہے۔ شاعر کا اوڑھنا بچھونا نقوش ہیں، وہ نقوش جو تحت الشعور میں محفوظ رہتے ہیں جنکا انتخاب اور جن کی تنظیم شاعر کا شعور ہیجان کی صورت میں کرتا ہے۔ لہٰذا علامتوں کے استعمال میں شاعر کے مقصد کا حصہ بہت کم ہے۔ اور نہ یہ علامتیں نمائشی تزئین کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، یہ شعر کا زیور نہیں

اس کا گوشت پوست ہیں۔ یہ علامتیں اور نقوش نہ صرف ادائے مطلب میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف کسی کیفیت یا منظر کا جیتا جاگتا مرقع سامنے لے آتے ہیں، بلکہ شعر کے زور، حسن اور اختصار میں ان سے نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہی نہیں ان کی تکرار، جدّت اور معنوی یگانگت کی ضامن ہے۔ کھرے اور کھوٹے، فطری اور مصنوعی کی تمیز کے لئے نقوش و علائم سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں۔ انکا وجود آرٹ کو پروپیگنڈے اور شاعرانہ خیالات کو فلسفیانہ افکار سے ممتاز کرتا ہے۔

بیسویں صدی میں مغربی تنقید نے الفاظ کے اس شعبہ پر بہت زور دیا ہے۔ شیکسپیئر جیسے اساتذہ کی تصانیف کی لفظ شماری کی گئی۔ دیکھا گیا کہ ایک ڈرامہ میں ایک نقش، ایک تصویر، ایک لفظ کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ اس طرح تصنیف اور مصنف کے متعلق قابل قدر انکشافات ہوئے جن کی صداقت میں کلام نہیں کیونکہ نقوش کی تکرار شاعر کے شعور کی ملمع کاری سے محفوظ رہتی ہے۔ ہمارے بعض نقاد اقبال کے علائم کو اسکی شاعری کا مدفن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اسکے برعکس ہے۔ یہ تو اسکی عظمت کا ثبوت ہیں اور انہیں تصنع اور سمیت کی بو ان ناقدین کو آئے گی جو اُردو اشعار کو جانچنے سے پہلے ان کا انگریزی میں ذہنی ترجمہ کر لیتے ہیں۔

اقبال اور انگریزی شاعر شیلے کی شخصیتوں میں بعد المشرقین ہے لیکن انکے

نقوش و علائم بعض خصوصیات میں مشابہ ہیں۔ شیلے کی طرح اقبال بھی اکثر قدروں کو ختم کر دیتا ہے۔ شیلی عقاب اور سانپ کی کشمکش میں بالترتیب نیکی اور بدی کا تصادم دیکھتا ہے اور شہاب ثاقب کو جسے دنیا منحوس سمجھتی ہے، وہ مبارک بتلاتا ہے۔ اقبال بھی رائے عامہ کے خلاف شاہین اور کبوتر میں شاہین کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی نظر میں وہ خونخوار اور ظالم نہیں، بلکہ غیرت، جد و جہد اور بلند حوصلگی کا پیکر ہے۔ اسی طرح موج کے طمانچے ساحل کی آغوش سے زیادہ دلکش ہیں۔ زمانہ اور اس کی قدروں کے خلاف ان دونوں شاعروں نے جو بغاوت کی تھی اس کا عکس اُنکی علامتوں میں بھی ملتا ہے۔ کیٹس کے برعکس اور شیلی کی طرح اقبال بڑی حد تک سکوت اور سکون کے تصور تک سے قاصر تھا۔ شیلے کی طرح اسکے حواس کو حرکت کا شدید احساس تھا۔ متحرک تصاویر سے اقبال کا کلام پُر ہے۔ لیکن شیلے سے اسکی مماثلت یہاں ہی ختم ہو جاتی ہے۔

علامتوں میں نہ صرف وہ نقوش داخل ہیں جن کے ذریعہ شاعر اپنے تمام زندگی کے نظریئے اپنے جذبات و احساسات، افکار و تخیلات متشکل کرتا ہے بلکہ وہ الفاظ وہ تصورات اور وہ نقوش بھی جن کا وہ نادانستہ طور پر اعادہ کرتا رہتا ہے۔

اقبال کی علامتیں اسکی وسعت مطالعہ، اس کی فلسفۂ زندگی اور اس کے مسائل حاضرہ پر عبور کے مرہون منت ہیں۔ اسکے اشعار میں ہر ہر قدم پر پیروی

فطرت کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ جن کی تکرار نے اقبال کے لب و لہجہ کو آفاقی آہنگ کی دولت عطا کی ہے۔

ہر بڑا شاعر جو کچھ کہتا ہے اس سے زیادہ کہہ جاتا ہے یعنی الفاظ کی سطح کے پیچھے معانی کی بے شمار تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور شاعر پر ہی کیا منحصر ہے، اچھے نثر نگار بھی مختلف قارئین کو انکے ظرف کے مطابق محظوظ کرتے ہیں۔ ڈین سولیفٹ کا شاہکار "گلیور کی سیاحتیں" بچوں کے لئے ایک دلچسپ کہانی ہے مورخین کے لئے اٹھارویں صدی کے نئے سیاسی اور معاشی نظام پر ایک گہرا طنز ہے سوانح نگار کو اس میں لاتعداد کارٹون نظر آئیں گے؛ اور اخلاقیات کے طالب علم کو اس میں مشکک کے ہذیان کی صدا آئے گی۔

ہمارے شاعروں میں اقبال نقوش کی کثرت اور ان کی وسعت اطلاق میں منفرد ہے۔ اسکے اشعار ایسے ہیں جن میں بیک وقت عاشق، محبوب، میخوار، ذہنیت رند صوفی، معرفت اور مورخ سیاست کی جھلک دیکھے گا۔

دراصل اقبال کے کلام کی بنیاد ہی علائم پر ہے۔ اس کی تعمیر ہی نقوش وتصاویر کے عنصر سے ہوئی ہے۔ یہی خصوصیت ہے جس نے فلسفہ کو شاعری کا مرتبہ دیا ہے، جس نے خیالات کو جذبات کی دلکشی بخشی ہے، جس کی بدولت

افکار و احساسات گھل مل گئے ہیں، جس کے طفیل میں خشک مسائل غزل کے حسن سے دمکنے لگے ہیں، جس کی بدولت اقبال کے کلام کے معنوی امکانات، بیکراں اور اس کے اشعار کی گہرائیاں اتھاہ ہو گئی ہیں۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست

حضرت اصغر گونڈوی

حضرت اصغر گونڈوی دور حاضر کے غزل گو شعرا کی صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں وہ ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ اور ہندوستانی اکیڈمی کے تماہی رسالہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے نثر اُردو کی بڑی خدمت کی۔ ان کی وفات سے غزل میں ایک باب ختم ہوگیا۔ اور اگر ان کی روایات کا کوئی حامل پیدا نہ ہوا تو وہ لطف رنگینی جو انھوں نے غزل میں جاری وساری کر دی تھی ختم ہو جائیگی۔

ان کے ذاتی حالات کے متعلق یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ ضلع گورکھپور میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم غیر مستقل طور پر ہوئی لیکن ذاتی مطالعہ کی عادت ان میں اول عمر سے تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی، عربی۔ اور فارسی پر کافی عبور رکھتے تھے۔ اور فلسفہ شاعری، ادب، اور فنون لطیفہ میں جو بلند نظری ان میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ قابل رشک تھی

ان کی آزاد طبیعت کسی استاد کی اصلاح کی متحمل نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنا ابتدائی کلام وجد بلگرامی اور امیر اللہ تسلیم کو دکھلایا۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنے ذوق صحیح اور وجدانِ سلیم پر بھروسہ رکھا اور اس کو ہی اپنا نکتہ چیں سمجھا۔

ان کا اخلاقی پہلو ہمارے نقطۂ نظر سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ حضرت اصغر فطرتاً آزاد منش آدمی تھے۔ تصوف کی چاشنی ان کے روح میں داخل ہو چکی تھی، اور رنگینی

ان کے مزاج میں ایک بڑی حد تک موجود تھی ۔لذتِ تصوف سے آشنا ہونے کے باوجود وہ دنیاوی تعلقات سے بیزار نہیں تھے ۔ اور آخری عمر میں شاعری سے زیادہ نثر کی طرف توجہ دیتے تھے ۔ان کا خیال تھا کہ ملک او رقوم کی خدمت صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے سے ہوسکتی ہے ۔ ہندوستانی اکیڈمی کے نماہی رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جو خدمات انھوں نے انجام دیں ۔ ان کا اعتراف ملک کے ہر صاحب ذوق کو ہے ۔

حضرت اصغر کی شاعری ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے ۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی مظہر ہے ۔ اور ان کا کلام ان کی زندگی کا عکس ہے ۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

"اس رنگ شاعری ہی نے رسوا کیا مجھے"

اصغر نے جبوقت شاعری کی دنیا میں قدم رکھا ہے غزل مردہ ہوچکی تھی انھوں نے حسرت موہانی اور فانی کے ساتھ اُردو غزل میں ایک انقلاب برپا کر دیا ۔غزل کو انھوں نے بلندی، وقار اور سرخوشی و نشاط سے مالا مال کیا ۔

اصغر کے یہاں فلسفہ اور شاعری دونوں ایسے گھلے ملے ہیں کہ اُردو شاعری میں اس کو جواب ملنا آسان نہیں ۔ان کی ایک مسلسل غــــزل ہے جسکا عنوان ہے ۔ "کیا ہوں میں" جس میں انھوں نے اول اول ایک فلسفی کی طرح اس سوال کا جواب دیا ہے ۔

فرماتے ہین ؎ تمام دفترِ حکمت الٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں مین

پھر کہتے ہین ؎ کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں مین

عالم کیا ہے خود اپنا عکس نظر اور کچھ بھی نہیں پھر انھون نے عقل اور یقین کی کشمکش دکھلائی ہے۔ ؎ کہان ہے سامنے آ مشعلِ یقین لیکر
فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں

غالب کے فلسفہ مین تسلسل نہیں ملتا اصغر نے اس رنگ کو بہت مستقل بنا دیا ہے یہ رنگ ان پر حاوی ہے۔ اور وہ اس رنگ پر۔

پھر وہ صرف شاعرانہ انداز سے اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہین۔ اور کس سادگی سے کہتے ہین۔

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں مین

یہاں عشق اور شوق فلسفہ کا مذاق اڑاتے معلوم ہوتے ہین۔ اس کے جمال اور خیال کی جاذبیت مین یہ فکر کس کو ہے۔ "کہ کیا ہوں میں" شاعر کو اس کاوش کی ضرورت نہین اور وہ اس سے بہت بلند ہے۔ اس کی دنیا جمال اور خیال کی دنیا ہے۔ اس کے فیض

سے شاعر ہے ۔
آلامِ روزگار کو آسان بنادیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جانان بنادیا

انسان کی تعریف اصغر نے ایک شعر میں کی ہے۔ اس کی جامعیت ملاحظہ ہو۔

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انسان بنادیا

وہ تعصب کی حدود سے باہر ایک دنیا میں رہتے ہیں جس کے متعلق کہتے ہیں۔

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے
نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اسکی نہ ایماں کو

یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر پہونچکر کفر و ایمان دونوں کو زبان کاری سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے ۔

جنونِ عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی
رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

ان کی بلند نظری اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

یہ دین یہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بتخانہ
اک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ

اصغر کی شاعری میں شانہ و آئینہ نہیں۔ ان کے یہاں عاشق قبر میں سے نہیں بولتا۔ فراق کے صدمے نزع کی ہچکیاں اور آہ و فغاں ان کے یہاں نہیں ملتیں۔ بقول خود

غزل گیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

غزل کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے ۔

اصغر غزل میں چاہیئے وہ موج زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

حسن سے انھوں نے خوشہ چینی کی ہے ۔ اور شراب کی سرخی بھی ان کے کلام میں موجود ہے لیکن ابتذال چھو کر بھی نہیں گیا ان کے اشعار مرد او رعورت بے محابا پڑھ سکتے ہیں ان کے کلام مین رنگینی کی ایک ہلکی لہر ہے ۔ کبھی یہ حد سے تجاوز نہیں کرتی ۔ اصغر کو ہلکا گلابی رنگ پسند ہے ۔ تیز سرخ رنگ انھون نے دوسرون کے واسطے چھوڑ دیا ہے ۔ فرماتے ہین ۔ سے

چمن مین چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موج صبا کی پاکدامانی نہیں جاتی

لیکن حسن کی دلشکنی ان کو منظور نہیں ۔ کہتے ہین ۔

جانبازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے

یہ شعر قدیم اُردو کی روایات کا حامل ہے لیکن پھر بھی اصغر نے اسمیں ایک رنگینی پیدا

کر دی ہے۔ اصغرکی باریک بینی اور بلند نظری ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

بس اتنے پہ ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہر درخشاں کو

لیکن فتنے حسن و عشق کی ہم آغوشی سے ہی نہیں اُٹھتے۔

کچھ فتنے اُٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے
پھر ایک مقام وہ بھی ہے جہاں۔

بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محو بیخودی
کچھ حسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

اُن کا خیال ہے کہ حسن عشق سے مستغنی نہیں رہ سکتا۔

اک نگار محجوبی اشکِ خوں میں ہے غلطاں
حسن کی نمائش ہے عشق کے بہانے سے

اور

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں
سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

اصغر کے رنگ تغزل کے یہ شعر اچھے نمونہ ہیں۔

جس پہ بتخانہ تصدق جس پہ کعبہ بھی نثار
ایک صورت ایسی بھی سنتے ہیں بتخانے میں ہے

اور ہے سراپا حسن وہ رنگین ادا جانِ بہار
حسن پر حسنِ تبسم صبحِ خندانِ بہار

اور ایک شعر ہیں۔

جلوۂ ذوقِ پرستش گریِ حسن نیاز !
ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

اصغر سرمست نہیں لیکن پھر بھی ان کی غزلوں میں ایسے شعر ملتے ہیں۔

ہاتھ میں لیکے جامِ مے آج وہ مسکرا دیا !
عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا !

اصغر شاعری میں مبتذل نہیں ہوتے ان کے اشعار میں سنجیدگی و شائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے حسن بیان، سوز و گداز، عالی ہمتی، ندرت اوان کے یہاں موجود ہیں لیکن سب اعتدال کے ساتھ۔ نہ ان کے اشعار میں اسرار و معارف کی کمی ہے۔ اور نہ تصوف کی لیکن وہ صرف غزل کہہ سکتے ہیں۔ شروع زندگی میں انھوں نے خطاب بہ ہلم۔ ایک مسلسل نظم کہی ہے جس میں آورد و تصنع کے علاوہ کچھ نہیں ہے اِس صنف میں نہ کوئی پیام ان کے پاس ہے۔ نہ کوئی درخشندگی۔ نہ کسی مقصد کا تعین۔ نہ جوش نہ ولولہ نہ تاثیر نہ کیفیت۔ ان کے بعض فلسفیانہ شعر گورکھ دھندھا بن کر رہ گئے ہیں۔

مثلاً قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو
اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

لیکن ہم کو ایک فلسفی کے نقطۂ نظر سے ان کی شاعری کا جائزہ نہیں لینا بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ ان کے فلسفیانہ انداز بیان نے غزل میں کوئی بلندی۔ کوئی سرور کوئی کیف پیدا پیدا کیا یا نہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

مئے یک رنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا
کبھی مینکش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

جس میں موسیقی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی اگرچہ فلسفۂ وحدت الوجود اصغر صاحب کی ایجاد نہیں۔ اصغر نے اردو غزل میں تخلیقی عنصر وسیع تر کر دیا ہے جس کی وجہ سے غزل میں لوچ اور شگفتگی پیدا ہو گئی ہے اور اب ہم غزل کو ایک فرسودہ صنف شاعری نہیں کہہ سکتے بلکہ بقول اصغر

دل حزیں میں شرارے دبے ہوئے ہیں ابھی
خدا کے واسطے آسے نے نواز رہنے دے

حضرت اصغر کی شاعری کے متعلق یہ چند جستہ جستہ خیالات ہیں۔ ان کی شخصیت ایک اور وجہ سے بھی جاذب توجہ ہے۔ وہ جگر مرادآبادی کی شاعری کی نشوونما ہے جو اصغر نے ایک خدمت سمجھ کر انجام دی۔

جگر کہتے ہیں ؎ حریم حسن معنی ہے جگر کا شانۂ اصغر
جو بیٹھو با ادب ہو کر جو اٹھو باخبر ہو کر

اور التجا کرتے ہیں کہ ؎ اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے

میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے

حضرت احسان اعظم گڈھی نے حضرت اصغر کے رنگ کا بہت کامیاب تتبع کیا ہے ان کے

چند اشعار سنیئے اور اندازہ لگائیے۔ کہتے ہیں۔

غمِ فراق سے کر اک سرورِ غم پیدا

یہ کیا کہ آنکھ سے آنسو گرا دیا تو نے

اصغر نے کہا تھا۔

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشین رہے

جبتک ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے

احسان کہتے ہیں۔

مانا کہ کچھ بھی حاصل دیوانگی نہیں

کیا کم ہے یہ کہ رقص میں جانِ حزین ہے

یہ حضرت اصغر کا صحیح رنگ ہے۔

ختم کرنے سے قبل آپ کو حضرت اصغر کے دو شعر اور سنانا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

مری رندی عجب رندی مری مستی عجب مستی

کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے

حسینوں پر نہ رنگ آیا نہ پھولوں میں بہار آئی

نہیں آیا جو لب پر نعرۂ مستانہ برسوں سے

جگر مراد آبادی

شعر کی بلندی اور شعرا کی پرگوئی کے لحاظ سے۔ نیز زندگی کے مختلف پہلوؤں کو شاعری کے احاطہ کر لینے کے خیال سے ہمارا موجودہ دور پچھلے دوروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ غالب کے فلسفۂ حیات کے مطالعہ۔ داغ کی زبان کی شستگی اور ظفر کے نالوں اور حالی کی کاوشوں نے ایک عظیم الشان عمارت کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ اقبال نے اس کو مکمل کیا۔ اب اس عمارت کی تزئین کی جا رہی ہے۔ اسمیں حسرت۔ جگر۔ جوش۔ ساغر۔ حفیظ۔ سیماب۔ اختر شیرانی سب ہی اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ حسرت اپنی سادگی و پرکاری سے جوش اپنے طنز کی تلوار سے۔ ساغر اپنی خوش بیانی و خوش نوائی سے حفیظ اپنے دوشیزاروں کی دنیا میں پریت کے گیت سنا سنا کر سیماب ہر شعر کو پختہ مضبوط اور منضبط کر کے اور اختر کبھی سلماؤں کے گیت سنا کر اور کبھی بے پناہ رجز پڑھ کر ایک انوکھی اور دلخوش کن آرائش تخئیل مہیا کر رہے ہیں۔ جس میں نغمہ محبت۔ سرمستی۔ بے خودی۔ جوش۔ سرور۔ آرزو۔ کاوش تپش بےچینی و کرب سب ہی کچھ ہے۔ اردو شاعری کو یہ بلندی ابھی تک نصیب نہیں ہوئی تھی۔

یہ زمانہ کسی ایک مخصوص ہنر میں کمال حاصل کرنے کا ہے۔ ہر شخص ایک خاص راہ اختیار کرتا ہے۔ اور اس میں اپنے آرٹ کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری کی دنیا میں جگر نے غزل کو اپنا لیا ہے۔ اور غزل نے ان کو۔ ان کو یہ دعوی نہیں کہ

جہاں کے شعرا کا "نہ قصیدہ، نہ مخمس، نہ رباعی نہ غزل" اُن کے آگے سرِ بہر ہوگا جب جگر رنگ و بو کی دنیا میں رہ پڑے۔ اُن کا دماغ اُس کی خوشبو سے معطر ہوگیا۔ انھوں نے اس رنگ و بو کی دنیا کو ہر روح پر مسلط کرنا شروع کردیا۔ ان کو ایک رنگین وادی میں جگہ مل گئی ہے اگر آوازہ گیر دوار اُٹھے بھی تو وہ اس کو اہمیت نہیں دیتے اور حسن و عشق کے نغمے الاپے جاتے ہیں۔

سناتے تھے لبِ نے سے کسی نے جو نغمے
لبِ جب گرتے مکرر سنائے جاتے ہیں

جگر خالص غزل گو شاعر ہیں دو تین نظموں کے علاوہ جن کا ان کی شاعری میں کوئی درجہ نہیں انھوں نے نظم کہی ہی نہیں۔ موجودہ دور میں وہ غزل کے پیغمبر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے دور کی شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جگر نے اپنی روش نہیں بدلی۔ جو چند نظمیں انھوں نے کہی بھی ہیں ان میں بھی رنگ تغزل کارفرما نظر آتا ہے۔ جوش، حفیظ، ساغر، احسان سب ہی نے غزل سے اپنی شاعری شروع کی۔ لیکن زمانے کے اقتضا سے بعد میں نظم کہنے لگے۔ جگر نے غزل ہی کہنا شروع کی۔ اور وہ اب بھی غزل ہی کہتے ہیں۔ کچھ نقاد جگر کے محض غزل گو شاعر ہونے پر نکتہ چیں ہیں میرے نزدیک یہ کوئی کمی نہیں۔ شاعر بنایا نہیں جاتا پیدا ہوتا ہے۔ جگر فطری شاعر ہیں ان کا رجحان طبع غزل ہی کی طرف ہے۔ اس لئے نظم نہ لکھنا ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں

اگر وہ نظم لکھیں گے تو ان کا درجہ کا ایک نقال کا ہو کر رہ جائیگا۔

باوجود اس کے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غزل کا میدان بہ نسبت نظم کے بہت تنگ ہے۔ اور ایسے غزل گو شعرا کی کمی نہیں جو ردیف و قافیہ کی قیود میں فرسودہ مضامین کو اشعار کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جو شاعری کو ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی فطرت اور ذہن دونوں شعر و شاعری کی سرحد سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

لیکن جگر کی شاعری اس قسم کی شاعری نہیں۔ اُن کی شاعری بہت بلند ہے وہ ایسے مقام پہ ہیں جہاں خود بخود شعر اُن پر نازل ہوتا ہے۔ اپنے نازک ترین احساسات کو وہ شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کی غزلیں ایسی ہی موثر ہیں جیسی حافظ کی۔ اُن میں وہی جادو وہی شیرینی وہی ہلکا ہلکا درد، وہی جاذبیت ہے جو حافظ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں وہ چیز ہے جس کو شاعرانہ سرشاری کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس حالت میں اُن کو ہر طرف حسن نظر آتا ہے۔ اور وہ بے خود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔ سہ

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں

جگر وہی کہتے ہیں جو اُن کے دل پر گذرتی ہے۔ وہ نہیں کہتے جو دوسرے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ جگر کے یہاں شاعر دیدہ بینائے قوم کا درجہ نہیں رکھتا۔ شاید وہ دیدہ بینائے قوم ہونے کو معیوب خیال کرتے ہیں۔ اُن کا اور اُن کے تعارف کرانے والوں کا خیال

ہے (ہر چند کہ اُن کو تعارف کی ضرورت نہیں) کہ ایسے شاعر "پیشہ ور خطیب اور واعظ" ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی اور اس کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔ تو آپ شاعر اور اگر آپ دوسروں کی زندگی پیش کرتے ہیں تو آپ بھانڈ۔ بہروپئے یا آج کل کے الفاظ میں ایکٹر۔ یہ نظریہ بہت مضحکہ خیز ہے وہ نظم کو اور نظم گو شعرا کی کاوشوں کو وجدان تعقل کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کر کے ایک "فراری" ادب میں خود کو گم کر لینا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں بنیادی طور پر نہ کوئی خیال نیا ہے نہ کوئی جذبہ لیکن زندگی نئی شاہراہوں سے گذر رہی ہے اس لئے ہمارے شعر و ادب کو خیالات کی نئی دنیا پیش کرنی چاہیئے۔ زندگی کے حقائق سے روگردانی کرنے سے "فراری ادب" پیدا ہوتا ہے۔ اور "فراری ادب" والوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

غزل گو شعرا کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے۔ اور زندگی صرف حسن و جمال عشق و محبت تک ہی محدود نہیں۔ زندگی اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے پھر بھی حسن و عشق کی دنیا کی رنگینی اور دلکشی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں جگر جہاں ہیں وہاں ان کے قریب بھی کوئی نہیں۔

شاعر لطیف ترین احساسات کا مجسمہ ہے اس کے دل پر جو کیفیتیں گزرتی ہیں وہ

اس کے اشعار میں حل ہو جاتی ہیں۔

اللہ اللہ رے ہستیٔ شاعر　　قلب غنچہ کا آنکھ شبنم کی

جگر کے اشعار پرکیف و سرور آور، اُن کے محسوسات لطیف اور ان کی غزلیں حسن و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

جگر کے یہاں شاعر کا مذہب محبت ہے۔ وہ ہر اس چیز کو عزیز سمجھتا ہے جس کو اسکا محبوب عزیز سمجھے۔

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

پھول وہی چمن وہی فرق نظر نظر کا ہے　　عہد بہار میں تھا کیا فصل خزاں میں نہیں کیا

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز　　کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اُن کی محبت کی دنیا نہایت لطیف و حسین دنیا ہے۔ وہ بہت ذوق و شوق سے کہتے ہیں کہ محبت کی دنیا میں بہار جاودانی حسن و نغمہ اور جوانی ہے اور کسی شے کو اس میں دخل نہیں۔

محبت میں جدھر دیکھو بہار جاودانی ہے　　ہجوم رنگ و بو ہے حسن و نغمہ ہے جوانی ہے

وہ محبوب کو قاتل کی صورت میں پیش نہیں کرتے کہتے ہیں۔

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار　　اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا!

محبت کے آنسو جس طرح جگر کی غزلوں میں ملتے ہیں ایسے کہیں اور مشکل سے ملیں گے۔
کہتے ہیں۔ انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے
اور جو ہیں خاص چشم و چراغِ محبت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے
مختلف قسم کے آنسو اُن کے کلام میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ خون کے آنسو۔ محبت کے آنسو۔ خوشی کے آنسو اور پھر سب سے بے نیاز خشک آنسو کہتے ہیں۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انسان پر
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

اور محبوب کے آنسوؤں کی تصویر وہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

ان کی محبت میں خودداری۔ خودنمائی۔ خوداعتمادی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہ ہی نہیں کہ در پر کسی کے پڑے رہیں۔ کہتے ہیں۔

محبت سے انکار کب تک کہاں تک
مرا نام بھی سُن کے شرمانے والے

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم ورخورِ اعتنا نہیں   عالمِ حسن کو مگر فرصتِ ما سوا نہیں

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا تھا گوشۂ نقاب ان کا

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو   یہ اور بات ہے تمہیں اب تک خبر نہ ہو

اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں   آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

لیکن محبت کرنا اور عاشق کا لقب پانا ہر شخص کا کام نہیں۔ عاشق کو سخت سخت منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔

عشق فنا کا نام ہے عشق میں زندگی نہ دیکھ
جلوۂ آفتاب بن ذرّہ میں روشنی نہ دیکھ

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے   اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اس منزل کے بہت سے راہرو پہلی دوسری منزل میں رہ جاتے ہیں۔ اُن سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ نہ استقلال نہ روشنی سرِ منزل امداد کرتی ہے لیکن ان منزلوں سے گذرنے کے بعد جب عشق کامل ہو جائے تو عاشق کو ہر وقت اپنے محبوب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر   جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

حسن کا جادو ایسا ہوتا ہے کہ

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا　　گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

جگر کے یہاں طلب صرف عاشق ہی کی طرف سے نہیں ہوتی محبوب کی طرف سے بھی سلسلہ جنبانی ہوتی ہے۔ گو اس کا اظہار اتنا بیّن نہ ہو۔

ہمارا ہی ہوگا نہ آغوش خالی!　　کچھ اپنا بھی پہلو تہی پائیے گا!
ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں　　تڑپ جائے گا جو تڑپائیے گا

عشق کی شان محبوبی ملاحظہ ہو۔

عشق ہی تنہا نہیں آشفتہ سر میرے لئے
حسن بھی بے تاب ہے اور کس قدر میرے لئے

جگر کے یہاں خوشی اور غم دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں وہ خوشی خوشی نہیں جس میں غم کی چاشنی نہ ہو۔ کہتے ہیں۔

ازل ہی سے چمن بند محبت　　یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے۔
کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے　　وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے۔

غم کا عنصر خوشی میں ہونا لابدی ہے۔ بغیر اس کے کوئی لطف نہیں۔

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

نہ ہو جس میں شامل ستم کا بھی پہلو   مرے حق میں وہ مہربانی نہیں ہے

ان کے یہاں طنز نہایت لطیف اور نازک ہوتا ہے۔ اس طنز کے پہلو میں حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے۔

مرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں
جو مسرتوں میں خلش نہیں جو اذیتوں میں مزا نہیں!
ترے حسن کا بھی قصور ہے مرے عشق ہی کی خطا نہیں

جگر کے یہاں فلسفہ و تصوف کے مسائل نہیں ملتے اور جہاں ان کی جھلک ملتی ہے ان کو فلسفہ کہنا درست نہیں۔ لیکن وہ ان کیفیات سے بھی گزرتے ہیں جب عشق میں فلسفہ کا رنگ نظر آتا ہے۔

نگاہِ شوق جگر وقفِ چار سو کیا ہے   جو دل حسیں ہو تو دنیائے رنگ و بو کیا ہے
نظر سے حسنِ دو عالم گرا دیا تو نے!   نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تو نے
یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود   مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے

اور

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

جگر کی شوخی نہایت دلکش ہوتی ہے۔

اب تجھے میری محبت کا یقین ہو کہ نہ ہو میں نہ کھاؤں گا ترے درد محبت کی قسم

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

وہ دن بھی قریب ہے کہ ظالم تو روئے گا مسکرائیں گے ہم
تجھ سے بھی ہوا حسین بن کر اپنا سا تجھے بنائیں گے ہم

جگر فطرتاً رنگین مزاج ہیں یہی رنگینی اُن کی شاعری کی جان ہے۔ ان کے اشعار کا اثر براہ راست دل پر ہوتا ہے کیونکہ وہ دل سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں سوز و گداز، جوش و خروش، سادگی و پرکاری سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ نرم و نازک احساسات سے ان کا شیشۂ سخن لبریز ہے۔ وہی حسن و عشق کا افسانہ ہے جسے وہ ہزاروں طرح سناتے ہیں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ان کا انداز بیان ہے کہ اس افسانہ کو شیریں سے شیریں تر کر جاتا ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر (خاص طور پر خود ان سے سنکر) دل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

محویت کے ایسے مرقعے ہماری شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے
کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل میں لگی تھی آگ افسوس ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے

اور
وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

محبوب کی عظمت ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

جب سے اس نے پھیریں نظریں رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ ویران آنکھیں خالی دل کی حالت کیا کہئے

اور جسے رونق ترے قدموں نے دیکر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی
وہ ان کی بے رخی وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

جگر کی زبان نہایت صاف شستہ اور بامحاورہ ہے۔ وہ زیادہ تر عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنی جگہ پر نہایت برمحل ہوتے ہیں۔ الفاظ پر ان کو مکمل قدرت حاصل ہے سادگی ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ داغ کے رنگ میں کہتے ہیں۔

مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ لیکن ہمیں نہ ہوں گے تو کیا کیجئے گا آپ

اور اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا

لیکن درحقیقت جگر کو اپنی شاعری کے لئے محبت کی ضرورت ہے۔ شراب کی نہیں۔

کہتے ہیں۔ جبتک شباب عشق مکمل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

جگر کی شاعری مبتذل مضامین سے پاک نہیں لیکن پھر بھی ادب کثیف کا عنصر ان کی شاعری میں جہاں کہیں بھی ملتا ہے۔ ایسا نہیں جو ذوق سلیم پر بار گذرے۔

مثلاً۔ آستینوں کا وہ چڑھا لینا گوری گوری کلائیاں توبہ

اس میں کچھ تو داغ کا سا اثر ہے۔ اور کچھ "شیریں دہن کے پاؤں" کا ورثہ۔ جگر حسن کے پجاری ہیں۔ لیکن ان کا عشق زندہ۔ سرکش و چالاک ہے۔ کہتے ہیں۔

محبت میں ہم تو جیئے ہیں جئیں گے وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

جگر کو کامل اعتماد ہے کہ عشق حسن کو ضرور اپنی طرف مائل کر سکتا ہے۔

ہو کے رہیگا ہمنوا وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ نغمۂ شوق گائے جا حسن کی برہمی نہ دیکھ

عشق و حسن کے رابطہ کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میں ان کا ہو گیا ہو گیا انھیں مسرور کر دیا وہ میرے ہو گئے مجھے مغرور کر دیا

محاکات کے تو وہ بادشاہ ہیں۔ جو مرقعے انھوں نے پیش کئے ہیں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔

اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی اب دست شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں
اُف وہ پروانے کہ سمٹے ہی چلے آتے ہیں ہائے وہ شمع کہ خاموش ہوئی جاتی ہے

غریب بلبل بہک رہی ہے قریب عارض چہک رہی ہے !
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دست رنگین بڑھا رہے ہیں

ان کے کلام میں لطافت حسن ومحبت کے رنگا رنگ پھول ملتے ہیں جو گلشن اردو میں اب تک نہ کھلے تھے ۔ ان کی شاعری حسن و شباب کیف و نغمہ کی شاعری ہے ۔ وہ روح پرسرور اور دل میں مستی بھر دیتے ہیں ۔ ایسی لے سے اپنا نغمہ چھیڑ دیتے ہیں کہ انسان محو ہو جاتا ہے اور اس کا دل سنتے سنتے سیراب نہیں ہوتا ۔

ان کا نغمہ ہے نغمہ آفریں   ان کا ہر ساز جنوں ساز رباب

انھوں نے غزل کو ساز و نغمہ ۔ کیف و مستی سے سیراب کر دیا ہے ۔ غزل کو لطافت اور رنگینی کا پیکر تمام بنا دیا ہے ۔ ان کی شاعری کی پوزیشن اردو کی دنیا میں وہی ہے جو فارسی ادب میں حافظ کی مخمور غزلوں کی ۔

نظیر اکبر آبادی کی نظم "آدمی نامہ" میری نظر میں

نظیر اکبر آبادی کی یہ نظم۔ نظم کیا ہے دنیا کی گوناگونی اور رنگا رنگی کا ایک مرقع ہے جنتا کے ایک شاعر نے یہ نظم جنتا کے لئے لکھی ہے۔ درباروں سے اس نظم کا کوئی تعلق نہیں۔ قصیدہ خوانی اور قصیدہ نگاری کے جھمیلوں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ نظیر بلند و پست۔ بادشاہ و گدا۔ زردار و بے نوا۔ ولی پنکر صاحب عزت اور مرد فقیر سب پر نظر ڈالتا ہوا اپنی دھن میں گنگناتا گاتا گزر جاتا ہے۔ ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ جو وہ کہہ رہا ہے اس میں ایک مرد درویش کی غائر بین نگاہ وہ دیکھتی ہے۔ جو ہمیں صاف طور پر نظر نہیں آتا۔

نظم کو اول سے آخر تک پڑھیئے۔ اگر کسی نے اردو شاعری کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے تو یہ نظم ضرور اس سے پہلے بھی پڑھی ہوگی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ یہ نظم میں اس سے قبل پڑھ چکا تھا۔ دوبارہ پڑھنے سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا لکھنے والا ہماری ذہنی سطح سے ہمیں دنیا کو دکھلا رہا ہے۔ وہ ہم کو دنیا کے بلند و پست دکھلا کر یہ کہتا ہوا کہ دیکھو یہ سب کے سب آدمی ہی ہیں۔ ہم کو سوچنے کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

اس نظم کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ سب آدمیوں کے آدمی ہونے کا نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ خاص توجہ کے قابل ہے۔ نظیر کے زمانہ کے بہت بعد تک

اردو شاعری میں یہ نظریہ پیش نہیں ہوا۔ ادب محل سراؤں میں پلتا رہا۔ لیکن نظیر کی شاعری کی نشوونما عوام میں ہوئی۔ اس لئے یہ نظم عوام کو اپنی طرف کھینچتی ہے اس نظم میں یہ خوبی ہے کہ یہ عوام کے دلوں میں اتر جاتی ہے ان کے دلوں میں اپنا گھر کر لیتی ہے اور ان کے دلوں کو گرماتی ہے۔

اس نظم میں زندگی کی جو قدریں نظیر نے پیش کی ہیں۔ وہ موجودہ زمانہ کے مطابق ہیں۔ نظیر کے جائزہ میں ایک ہم آہنگی ہے۔ وہ سب کو اس نظر سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ سب آدمی پہلے آدمی ہیں بعد میں کچھ اور۔ اور اگرچہ مختلف آدمی دنیا میں مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں لیکن پھر بہرحال آدمی ہیں۔ یہ ہم آہنگی اس نظم کی جان ہے نظیر یہ مختلف حیثیتیں بیان کر کے نظم ختم کر دیتا ہے۔ لیکن دلوں پر یہ اثر ضرور ہوتا ہے کہ دنیا کے جاہ و مرتبہ سطوت و جلال کی کوئی حقیقت نہیں اور ایک مرد حق پرست کی نظر میں سب برابر ہیں۔

نظیر ۱۸۲۰ء تک زندہ رہا۔ اس کی یہ نظم بھی تقریباً سوا سو سال پرانی ہوگی۔ لیکن اس کے پڑھنے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ہمارے زمانہ کی قدروں کے مطابق لکھ رہا ہے۔ نظم کا تسلسل اور اس کی سادگی اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے قابل قدر ہے۔ سوا سو برس کی عمر کے باوجود نظم کی شادابی اور اثر میں فرق نہیں آیا۔ اور اس کی زبان ایک دو جگہ کے علاوہ وہی ہے جو عوام بولتے ہیں۔

یہ نظم اُردو شاعری کے ایک خاص اسکول سے تعلق رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کا اس شاعری سے کوئی تعلق نہیں جو اس زمانہ میں رائج تھی۔ اور اس کے بہت بعد تک ہمارے ادب میں اصلی سکّہ بن کر چلتی رہی۔ یہ ایسے شاعر کی نظم ہے۔ جو ایک صوفی منش شخص تھا۔ اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے بھی مرعوب نہ ہوتا تھا۔ خدا کی خدائی میں پوزیشن اور جاہ و مرتبت کے باوجود وہ انسانوں میں انسانیت کا ایک مشترک پہلو دیکھتا ہے اور انسانوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔

میرے خیال سے یہ نظم اگر کوئی موجودہ زمانہ کا شاعر لکھتا تو اس کا مرتبہ ہماری شاعری میں کچھ معمولی نہ سمجھا جاتا۔ اس نظم کی آب میں سوا سو سال میں کوئی فرق نہیں ہو آیا بلکہ اس کا رنگ اب اور نکھر رہا ہے۔

چند نئی کتابیں

۱۔ مکاتیب غالب از مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتبہ مولوی امتیاز علی عرشی۔ ناظم کتب خانہ ریاست رامپور مطبوعہ مطبع قیمہ بمبئی۔

۲۔ مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم از نیاز فتحپوری پبلشر نگار بک ایجنسی لکھنؤ۔ مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس۔

۳۔ جام طہور از عبد السمیع پال آثر صہبائی۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

مرزا غالب کے خطوط کا مجموعہ اردو میں خاصے کی چیز ہے۔ اردو نثر میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو تغیر اور تبدیل ہوا اس کا سہرا مرزا غالب کے سر رہیگا۔ اگر ہم کو ان کے دو شعروں کا مرکب بنانے کی اجازت ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ۔

قدر نثر من بگیتی بعد من خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

غالب پر پچھلے سال کئی پایہ کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر "انقلاب" کی سوانح عمری غالب جس میں انھوں نے غالب کی زندگی کے حالات اُن کے فارسی اور اردو نظم و نثر کے مجموعہ سے تیار کی ہے۔ قابل قدر چیز ہے۔ اسی طرح شیخ محمد اکرم کا غالب نامہ جس میں غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کی گئی ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولوی امتیاز علی کے مرتبہ خطوط اب تک منظر عام پر نہیں آئے تھے انھوں نے رامپور

رامپور کی سرپرستی میں غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں فردوس مکانی نواب کلب علی خاں خلد آشیانی والیان رامپور اور دیگر متعلقین دربار کی خدمت میں ارسال کیے یکجا کر کے شائع کیے ہیں۔ یہ غالب کی زندگی پر نئی روشنی ڈالتے ہیں۔

غدر ۵۷ء کے بعد صاحبان فضل و کمال جگہ جگہ سے آکر دربار رامپور کی سرپرستی میں زندگی گزارنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو رامپور آئے ٹھہرے اور چلے گئے۔ لیکن رامپور کے قدر شناس فرمانرواؤں نے ان کی امداد اور سرپرستی اپنا فرض سمجھا۔ اُن میں غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی وساطت سے نواب یوسف علی خاں غالب سے فن شعر میں مشورہ کرنے لگے۔ اس رشتہ کی بدولت ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربار رامپور اور مرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔ غالب کے وہ مراسلات جو محکمۂ دارالانشاء رامپور میں محفوظ تھے۔ غالب کی وفات کے ۷۰ سال بعد اب پہلی مرتبہ شائع ہوئے ہیں۔

"مکاتب غالب" غالب پر جو لٹریچر ہے اس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے مولانا غلام رسول مہر کے "غالب" اور مسٹر محمد اکرام کے "غالب نامہ" میں غالب کے تعلقات رامپور پر جو ان کی آخری زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ کماحقہ روشنی نہیں ڈالی گئی جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو کافی مواد دستیاب نہ ہو سکا۔ اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے اور قابل مصنف کے ۱۸۳ صفحے کے طویل دیباچے نے جس میں انھوں نے غالب کی سوانح

غالب کے آرٹ اور غالب کی پرائیوٹ زندگی پر سیر حاصل بحث کی ہے اس کو اور بھی قابل قدر بنا دیا ہے۔

ان مراسلات میں غالب نے درباری زبان اور درباری انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں ایک قصیدہ ارسال کیا جس کا مطلع ہے۔

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم
بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

اور ازروئے احتیاط اس کو بیرنگ بھیجا۔ کچھ دن انتظار کیا لیکن جب کچھ شنوائی نہیں ہوئی تو لکھا۔

"جناب عالی۔ طرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ اور اپنی قسمت کا گلہ۔ خدا کا شکر یہ کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔ یہ نومبر ۱۸۵۸ء انیسواں مہینہ ہے گویا بن کھائے جیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشنداروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھئے کیا نیا گل کھلے گا۔ پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے۔ کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکۂ معظمہ عالی مقام ہو گیا ہے۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں۔ اور وزرائے ملکۂ دارا اور بان کے دوسارٹی فکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیئے تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیئے۔

نوشتہ دی کا طالب غالب"

لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو صاف صاف لکھا۔

"جو آپ بن مانگے دیں۔ اس کے لینے میں مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حاجت آپڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں

بارِ گرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگ دست تھا اب تہی دست ہو گیا ہوں جلد میری خبر لیجئے اور کچھ بھجوا دیجئے۔ عنایت کا طالب غالب"

قصیدہ میں غالب کی خودداری نے حسنِ طلب سے بھی کام نہیں لیا۔ دوسرے خط میں اپنی حالت کی طرف اشارہ کیا۔ تیسرے خط میں صرف مطلب زبان پر لائے۔ زیادہ تر مکاتیب میں یا تو تنخواہ کی رسید ہے یا تنخواہ کا تقاضا۔ نواب خلد آشیاں کے نام مندرجہ ذیل خط غالب کی بیچارگی کی اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تقدیم مدارج تسلیم معروض ہے۔ میں نے ہنڈوی فلسفہ کے ذریعے بابت تنخواہ اگست ۱۸۶۶ء روپیہ وصول پایا۔

لکھوں آپ سے تو کس سے کہوں　　مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد حسین علی خان کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے دو عطا کیجئے۔ اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجئے۔ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں پچاس ہزار

زیادہ حد ادب۔ عرضداشت دولت خواہ اسد اللہ"

ان مکاتب سے غالب کی بے تکلفی اور اخلاص ظاہر ہوتا ہے۔ نواب فردوس مکان سے ان کا تعلق برابر خلوص پر مبنی تھا۔ اس لئے اگر روپیہ کی ضرورت ہوتی تو مرزا صاحب بلا تکلف سرکار سے مانگ لیا کرتے تھے۔ قرض سے ان کو نفرت تھی لیکن وہ عمر بھر مقروض رہے۔ مرزا صاحب قرض کا بار بہت محسوس کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس بلا سے نجات حاصل ہو جائے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار سرگرم تقاضا بلکہ آمادہ شور و غوغا تھے دو سو روپیہ کی ہنڈوی صراحی آب حیات ہوگئی۔ دام مرگ سے نجات ہوگئی"

غالب کے لوازمات امارت اس قسم کے تھے کہ وہ قرض سے کبھی سبکدوش نہ ہوسکے۔ اور اگرچہ

قرض کی پیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

انھوں نے زندگی آرام سے گذاری۔ ان کے پرستار و قدردان برابر ان کی خدمت کرتے رہے۔ غالب نے بعض مکاتب میں اپنی وفاداری خلعت و خطاب کا ذکر بڑے افتخاراً و ناز سے کیا ہے ان کی شاعری میں تصوف کے مسائل بکھرے پڑے ہیں۔

لیکن وہ اپنی زندگی میں بلند نظری کا ثبوت پیش نہیں کر سکے۔
ان کا تصوف امیروں کے آستانہ کی ناصیہ فرسائی اور درباروں میں جبیں سائی کرتا رہا۔ ان سے ایک یہ نعرۂ مستانہ بلند نہ ہو سکا۔

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے　　　خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

لیکن ان میں ایک خودداری تھی جیسا کہ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ گو مرزا صاحب نواب صاحب کو "ولی نعمت" اور "آیۂ رحمت" سمجھتے تھے۔ لیکن ادبی معاملات میں ان کے سامنے بھی سررشتہ خودی نہ چھوڑتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ فارسی فرہنگ نویسوں پر غالب نے کچھ اعتراض کئے جس پر نواب صاحب کے اہل دربار نے اعتراض کئے اور نواب صاحب نے بھی ناخوشگی ظاہر کی۔ اس پر مرزا صاحب نے جواب دیا۔ "ان باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افتادگی اور بیچارگی کی حالت میں بھی اقلیم ادب کے اس بادشاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ کم از کم اس کی اپنی اقلیم میں کسی اور کا "سکہ" چلے۔

مرزا نے گیسوئے اردو کو طرح طرح سے سنوارا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ شیخ سعدی کی گلستان کی طرح اس قدر سہل معلوم ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی ایسا لکھ سکتا ہوں۔ لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ مرزا ادب

فارسی کے بے بدل ماہر تھے۔ انھوں نے زبان فارسی کے وہ تمام محاسن جو کئی ہزار نادرہ کار دماغوں کی گیارہ سو برس کی جانفشانی سے بہم پہنچے تھے۔ اُردو جیسی کم عمر اور تہی مایہ زبان میں بھر دئے۔

مرزا کو خطوط سے تفریح ہوتی تھی۔ وہ دماغ سوزی اور جگر کاوی کے لئے خطوط نہیں لکھتے تھے۔ انھوں نے اردو کو اسی لئے اپنے خطوط کے واسطے اختیار کیا ان کے اردو مکاتیب ان کے تفریحی مشغلوں کا جزو بن گئے تھے ان کی ظریف طبیعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اور ان کے خطوط کو خلوص یگانگت اور بے تکلفی کا مرقع بنا دیا۔

مرزا غالب خطوط میں بھی وہی انداز اختیار کرتے ہیں جو مکتوب الیہ سے ملاقات کے وقت زیبا ہوتا۔ انھوں نے اپنے تمام خطوط کو مکالمہ بنا کر اس میں طبعی ظرافت کی تخم ریزی کی۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام کسی ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"مرزا صاحب۔ میں نے تو وہ انداز ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"

مکاتیب غالب کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

نیاز فتحپوری اُردو نثر کے باکمال صاحب طرز ہیں۔ اُن کا رسالہ یقیناً اس شہرت کا مستحق ہے۔ جو اس کو حاصل ہے۔ اس رسالے کے ہر نمبر میں ایک مضمون

سوال و جواب کے عنوان سے ہوتا ہے۔ "استفسار و جواب" جس کی اب تیسری جلد شائع ہوئی ہے ان ہی سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے۔

نیاز کی وسیع معلومات کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ہر قسم کے سوالات پر جو مختلف موضوع پر مشتمل ہیں نہایت سلجھی ہوئی بحث کی ہے۔ آپ کے استفسار و جواب میں شاید ہی کوئی ایسا موضوع بچا ہو جس پر کچھ نہ کچھ اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔

شعر و ادب۔ مذہب۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ پولٹیکس۔ تعلیم و تعلّم۔ تصوّف و فلسفہ۔ نجوم غرض کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو آپ کی کتاب میں کمی یا زیادتی کے ساتھ نہ پایا جاتا ہو۔ "استفسار و جواب" کو ہم ایک قسم کی انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا میں ہر موضوع مختلف ابواب میں منقسم ہوتا ہے۔ لیکن استفسار و جواب میں اس چیز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ کتاب مختلف ہیڈنگس کے ماتحت مرتب کی جاتی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس رائے کا نیاز صاحب نے مختلف مباحث کے سلسلہ میں اظہار کیا ہے۔ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر صائب ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ہر مسئلہ پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہوا ہے۔ نہایت صاف طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جو چیز کہ نیاز صاحب کے افسانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ یعنی نامانوس الفاظ اور عجیب ترکیبیں۔ ان کی بھرمار اس کتاب میں اتنی نہیں۔ وہ ابوالکلام سے اس خصوصیت میں ملتے ہیں لیکن ان میں اور ابوالکلام میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ابوالکلام کو اپنے موضوعِ مذہب کی بنا پر سنجیدگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

نیاز صاحب کا موضوع ادبیات اس قید سے آزاد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں شوخی، رنگینی اور رعنائی جھلکتی نظر آتی ہے۔

استفسار و جواب اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس میں بعض اہم مسائل پر ایک جرنلسٹ اور نقاد نے رائے زنی کی ہے۔ یہ ہر تعلیم یافتہ شخص کی میز پر رہنے کی مستحق ہے۔

"جامِ طہور" عبدالسمیع پال اثر صہبائی کی رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے۔ عمر خیام کا اثر شروع کی رباعیات پر بہت گہرا ہے۔ اثر صہبائی عمر خیام سے اس امر میں متفق ہیں کہ گردشِ زمانہ کسی شے کو اپنی جگہ مستحکم نہیں رہنے دیتی۔ انسان آزاد نہیں ہے۔ اندوہ و غم کے بادل اس کے سر پر برابر منڈلاتے رہتے ہیں۔ دنیوی زندگی عارضی ہے اور موت کا کوئی چارہ نہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان سب کا علاج تعیش کی زندگی نہیں بلکہ تزکیۂ نفس ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں ذکرِ الٰہی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ کہنا

کہ عمر خیام کے نزدیک اس کا علاج تعیش کی زندگی تھا۔ درست نہیں۔ غالب اور عمر خیام کا فلسفۂ زندگی کچھ ملتا جلتا ہوا تھا۔ غالب کا عقیدہ تھا کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اور عمر خیام کا۔ مے خوردن نہ از برائے طرب است
نے بہر فساد و ترک دین و ادب است
خواہم کہ بہ بے خودی بر آرم نفسے
مے خوردن و شاد بودنم زیں سبب است

عمر خیام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

حوران بہشت کی تمنا بے سود ہنگام شباب زہد و تقویٰ بے سود
لبریز نشاط ہے خمستان حجاز یاں غم دوش و فکر فردا بے سود

تاریکیٔ اندوہ ہے باقی ساقی ہاں بادۂ دلفروز ساقی ساقی
بہ رنگ یہ محفلیں رہیں نہ رہیں ہے عہد شباب اتفاقی ساقی

عمر خیام کے بعد آتو صہبائی نے برگسان۔ گوتم بدھ اور شنکر آچاریہ کے فلسفۂ حیات کا ایک عمیق مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادی خوشی کا طلسم توڑنے میں کامیاب ہوئے

اور کہنے لگے۔ نیرنگ طلسم زندگی کو پایا
آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہے اگر تو ذکر یزداں میں اثر
سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا

جام و مینا سے تنفر اسی فلسفیانہ تصوف کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

اے کاش ہر ایک آنکھ بینا ہو جائے ہر سینہ فروغ برق سینا ہو جائے
لذت کش جام عشق ہو جائے دل بیگانۂ ذوقِ جام و مینا ہو جائے

فلسفۂ حیات و موت اثر صہبائی کے یہاں ہر رنگ میں ملتا ہے۔ دو مختلف جذبات دو رباعیوں میں دیکھئے۔

رازِ عدم و وجود پایا نہ گیا! یہ پردہ مرگ و زیست اُٹھایا نہ گیا
انکار بھی ہو سکا نہ مجھ سے ہمدم ایماں بھی مگر خدا پہ لایا نہ گیا

لیکن پھر صحیح راستہ پر آ گئے اور کہا کہ

ہر شے ہے فنا پذیر جز جلوۂ حق ہر نغمہ ہے شور خام جز نغمۂ حق
ہر کیف و سرور کا ہے انجام خمار بے رنج و غم خمار ہے بادۂ حق

ساتھی جھوٹے ہیں سب حق کے سوا ہوتا ہے کسی کا کوئی کب حق کے سوا

اے دوست نہ چھوڑنا کبھی دامن حق　　ہر چیز ہے بے ثبات حق کے سوا

اثرؔ کے یہاں اقبالؔ کی شوخی بھی ملتی ہے۔ مثلاً

پیدا کیا اہرمن تو کیا تجھ کو ملا　　ہاں خوب جواب اے خدا تجھ کو ملا
آدم بھی ہوا ہے اب اسی کا ہمدم　　خمیازہ کئے کا اے خدا تجھ کو ملا

اور

اک شے کو ادھر وجود میں لاتا ہے
اک شے کو اُدھر عدم میں پہنچاتا ہے
تخلیق ہے دم میں اور دم میں تخریب
اس کھیل میں تجھ کو کیا مزا آتا ہے۔

کبھی حسرتؔ موہانی کے بلند مقام تک جا پہنچتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

نظارہ ہو نہ سکا جلوہ حقیقت کا　　بیاں ہو نہ سکا مدعا محبت کا!
زبان بولتی اور آنکھ دیکھتی ہی رہی　　مگر وہی ہے ابھی تک مقام حیرت کا

اثرؔ کے کلام میں رنگینی، نغمہ سوزی۔ اور عمق پایا جاتا ہے۔ ان کی لطیف رباعیات اور قطعہ بڑے پر اثر ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

ہماری شاعری

سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں ..... مکتبہ اردو لاہور

سنہ ۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں ..... ادبستان لاہور

میری بہترین نظم ..... کتابستان الہ آباد

سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں ..... نگارستان ایجنسی دہلی

سنہ ۴۲ء اپنی مجموعی داستان کی بناء پر دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے۔ اس سال مہذب اقوام نے وہ کارنامے کئے کہ انسانی روح کانپ اٹھی مغرب کے سیلاب کا اثر مشرق پر بھی ہوا اور یہاں بھی زندگی میں وہ خلفشار اور سماج کی بنیادوں میں وہ زلزلہ آیا کہ اس سے قبل کبھی نہیں آیا تھا۔

الفاظ کے معانی و مطلب بدل چلے

ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

دیرینہ نظام ہچکولے لے رہا ہے دیرینہ قدریں بدلی جا رہی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہی حال ہماری شاعری کا ہے داغ کے زمانہ کی شاعری اس عہد کی آئینہ دار تھی۔ ہمارے دور کی شاعری ذہنی بغاوت۔ اشتراکی رجحانات۔ سماجی خلفشار اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے عبارت نظر آتی ہے۔ زندگی اب ایک جوئے خوابیدہ نہیں رہی۔ تیز

اور سیلاب بر کف دہارا بن گئی ہے۔ اس ہیجان عظیم میں ضروریات زندگی کے ساتھ کاغذ بھی گراں کیا نایاب ہو گیا ہے۔ ؎

خط نہ لکھنے کہ نیا عُذر یہ نکلا حسرت!
جنگ یورپ میں وہ کہتے ہیں گراں ہے کاغذ

اس گرانی اور کمیابی کے باوجود اُردو میں اچھی کتابوں کا شائع ہونا ہمارے اَدب کی صحت کا بین ثبوت ہے۔

اور ممالک میں انتخاب اور ادب کا نچوڑ طرح طرح کی شکل میں شائع ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ادب کا بہترین حصہ عام لوگوں تک پہنچ جائے۔ اور ان کے مذاق کی اصلاح کرتا رہے۔ ہمارے یہاں اس قسم کے مجموعے کم ہیں۔ ۴۲ء کی نظموں کے دو انتخاب بہترین نظمیں اور منتخب نظمیں لاہور سے اور خود شعرا کی منتخب کردہ نظمیں البستان الہ آباد سے شائع ہوئی ہیں۔ لاہور والے دونوں مجموعوں میں بعض نظمیں بہت بلند پایہ ہیں۔ بعض معمولی اور بعض ایسی جو شاید آئندہ کبھی اچھے انتخاب میں جگہ نہ پا سکیں۔ شاعروں کے لحاظ سے مکتبہ اردو والا انتخاب دوسرے انتخاب سے زیادہ نمائندہ حیثیت رکھتا ہے۔ بہترین نظمیں حلقہ ارباب ذوق کی ایک سب کمیٹی نے پسند کر کے شائع کی ہیں۔ اس میں ارباب ذوق کی اپیل کی چیزیں بھی ہیں۔ اور حلقہ احباب کی بھی۔ لیکن مجموعی طور پر یہ انتخاب بھی بلند پایہ ہے۔ بعض نظمیں دونوں انتخابوں میں ملتی ہیں۔ اور یہ نظمیں واقعی اس قابل ہیں کہ یہ

کسی انتخاب میں جو موجودہ عہد کا کوئی صاحب ذوق کرتا ضرور ہوتیں۔ مثلاً راشد کی "زنجیر" احتشام حسین کی "تصویر کے دھندلکے" احمد ندیم قاسمی کا "آخری سجدہ" "کتابستان الہ آباد نے خود شعرا سے اپنی اپنی بہترین نظم پسند کرا کے ایک مجموعہ "میری بہترین نظم" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کی ترتیب محمد حسن عسکری صاحب نے کی ہے۔ یہ طریقۂ انتخاب جدت پسندی کی دلیل ہے۔ اس انتخاب میں بعض بعض چیزیں توجہ کو مسحور کرتی ہیں۔ مثلاً احسان دانش جو طویل نظمیں لکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بہترین نظم جس میں صرف تین شعر ہیں۔ اس مجموعہ کے لئے بھیجی ہے وہ شاعر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبہ خوددار　　ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت
قرآن کی عظمت دلِ فرعون کا انکار　　جبریل کی پرواز پیمبر کی رسائی

سب سے زیادہ ان پر اقبال کا اثر ان اشعار میں معلوم ہوتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم "کسان" کا انتخاب کیا ہے جوش اسمیں پوری گھن گرج سے جلوہ گر ہیں اور اس نظم میں ان کی فطری تندی اور رجز خوانی کا پورے طور پر اظہار ہوا ہے کہتے ہیں

مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روشنا　　ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں　　خون جنکا دوڑتا ہے نبض استقلال میں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں　　سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں

سرمایہ داری کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی　　بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں　　کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بیتاب ہیں

حفیظ جالندھری نے اپنا "پریت کا گیت" منتخب کیا ہے۔ وہ ہندی کے الفاظ استعمال کر کے اُردو میں ایک نئی شیرینی بھر دیتے ہیں۔ لیکن بعض بعض جگہ ہندی کے بالکل نامانوس الفاظ بھی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ حفیظ کے گیت بہت شیریں ہوتے ہیں اور اپنے گیتوں کی بنا پر ان کا رتبہ ہمارے عہد کی شاعری میں کافی بلند ہے۔ اس مجموعہ میں نئے اور نوجوان شعرا کی نظمیں بھی ہیں۔ بلنک ورس کو بھی اس میں جگہ دی ہے۔ راشد کی نظم "دریچے کے قریب" اور میراجی کی "ترغیب" بھی اس مجموعہ میں ملتی ہیں۔ میراجی "رسیلے جرائم" کی خوشبو سے وہاں خود جاتے ہیں اور اپنے سننے والوں کو بھی لے جاتے ہیں جہاں

قوانین اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جھرمٹ میرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوس ریشم کے اور ان کی لرزش
میرے ذہن میں آ رہی ہے۔
رسیلے جرائم کی خوشبو

معلوم ہوتا ہے کہ راشد کی نظم "دریچے کے قریب" بڑے غور و خوض کے بعد کہی گئی ہے

ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشہ میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے۔
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں۔
بڑھ کر ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے

یہ ڈوبتی ہوئی قوموں پر ایک ایسا تبصرہ ہے جس سے ہماری شاعری تشنہ ہے۔ اس مجموعہ میں فیض کی وہ حسین نظم بھی ہے جس کا عنوان ہے۔ "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ"۔ شاعر اول اول محبت کے طلسم میں گرفتار ہو کر اپنی اور اپنے محبوب کی ذات کو دنیا میں سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ آہستہ آہستہ جب دنیا کے اور مناظر اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ تو وہ ایک دم چکا چوند محسوس کرتا ہے۔ اس کو اور چیزیں بھی نظر پڑتی ہیں جنکی حقیقت اور اہمیت زندگی میں محبوب اور محبت سے کچھ کم نہیں۔ یہاں وہ بنی نوع آدم کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کے قلم سے وہ اشعار نکلتے ہیں۔ جو زندگی کے مختلف شعبوں پر حاوی اور ان کے آئینہ دار ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانہ میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

تاثیر کی نظم ادلستان والے مجموعہ میں سب سے پہلے ہم کو ملتی ہے۔ اس نظم کو ادبیت کا شرف

ہر طرح حاصل ہے۔ یہاں شاعر انقلاب کی تمنا سے اس قدر سرشار ہے کہ کہتا ہے۔

تو میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کود دوں گا میداں میں
حیاتِ جاوداں پنہاں ہے آب تیغ براں میں
بہار آ جائے شاید اس طرح میرے گلستاں میں
خزاں چھائی ہوئی ہے مدتوں سے میری دنیا پہ

تاثیر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت کامیابی سے آڈن کی نظم کو اردو کا جامہ پہنایا۔ راشد دنیائے زنجیر میں ایک نئی جنبش نئی لرزش دیکھتا ہے اور نجات کی تمنا میں سلاسل کو توڑ کر ہنگام یا آورد کو چپکے شبخوں بنانے کا مشورہ دیتا ہے۔ ادھر احتشام حسین تصویر کے دھندلکے میں روح کو گرماتے ہیں۔

وہ بگل جنگ کے بجنے لگے اب جاتا ہوں
خود کو ایک اور ہی جادہ پہ رواں پاتا ہوں
پھر ہے میدان عمل سامنے مسرور ہوں میں
اب خیالات کی دنیا سے بہت دور ہوں میں

اور مجاز شاعرانہ سرشاری میں کہنے لگتے ہیں۔

لے کے ایک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں — تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں — اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں　　اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں

تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ایران میں سیاسی کشمکش اور طوائف الملوکی کے عہد میں سب سے بڑے شاعر پیدا ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی یہی حال ہے۔ عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہندوستان کے سب سے زیادہ پرآشوب زمانہ میں پیدا ہوا۔ اس کی شاعری کو سیاسی کشمکش ملکی و ملی تحریکات نے زندگی بخشی یہاں تک کہ وہ دیدہ بینائے قوم سمجھا گیا۔ اقبال نے اردو شاعری اور حیات ملی کو ہم آہنگ کر دیا۔ اقبال کے اس اثر سے ہمارے سب نئے شاعر فیض یاب ہوئے۔ اقبال کی طرح ہمارے موجودہ شاعر عالمگیر مسائل سے بھی شدت کے ساتھ متاثر ہوئے۔ موجودہ جنگ نے انسان کو بربادی اور بھوک سے دوچار کر دیا

سیاسی جھمیلے اور سماجی بندھنیں جنگ کے سایہ میں اور بھی تند و تیز ہو گئیں اس کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا ردعمل بھی شروع ہوا۔ روح ہر وقت تو تشنہ نہیں رہ سکتی جبلی ترغیبات انسان کو "رسیلے جرایم کی خوشبو" سنگھاتی ہی رہتی ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر فراری رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جب انسان چند آرٹ کے خطوط ریشمی ملبوس اور غازہ کی دمک میں خود کو گم پاتا ہے۔

موجودہ عہد ہندوستان کی تاریخ کا پرآشوب عہد ہے اس میں ہر چیز شدید ترین صورت میں جلوہ گر ہے۔ زندگی کے تمام نقوش ابھر آئے ہیں۔ اور ہر چیز بے تاب معلوم ہوتی ہے

ہر سپہر تھرتھراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔
دیکھئے کس کس کو مزاریں آسودگی نصیب ہو۔ اور کون کون اس انقلاب بادباراں کا مقابلہ کرسکے۔

ہمارے شاعر اب قصۂ پارینہ نہیں سناتے چونکہ وہ ہم میں سے ہیں اور ہمارے دوش بدوش کھڑے ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اس لئے جو وہ کہتے ہیں اس کی براہ راست اپیل دل و دماغ سے ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وہ نظم جو ہمارے شاعر لکھتے ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ لیکن ان نظموں میں ایسی گراں بہا چیزیں بھی ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمارے ادب کی چوٹی کی چیزوں میں شمار ہوں گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ردیف اور قوافی کی پابندی سے شاعر نے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض شاعر صرف بلینک ورس میں لکھتے ہیں۔ یہ تجربہ ہمارے ادب کے لئے نیا تھا۔ لیکن اس کے افادی پہلو سے ہم انکار نہیں کرسکتے۔ آزاد نظم نے ہماری شاعری میں ایک عمق اور شادابی پیدا کردی ہے۔ اب لوگ اس تجربہ کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا شاعر زندگی کی ہر منزل میں گامزن نظر آتا ہے۔ عہد حاضر کا شاعر خود جنگ کی صف اول میں ہے۔ اگر وہاں نہیں بھی ہے تو بھی اس کے دل میں ایک طوفان۔ ایک زلزلہ۔ ایک محشر ہر وقت برپا ہے۔ اور اسکی آرزو یہی ہے کہ وہ پرانے نظام کو نئے نظام سے بدل دے۔ اسکی روح میں ہر وقت یہی خلفشار ہے۔ جو مجاز کے اشعار سے پھٹا پڑتا ہے۔

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو   عام اب لطف مے و ساقی و میخانہ ہو

ادارۂ ادب لطیف کے مجموعہ میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو ہماری شاعری کی یہ تصویریں اور نقوش دکھلاتی ہیں۔ چند ایسی چیزیں بھی ہیں جن میں خالص نغمہ اور محبت کے گداز کی چاشنی ہے۔ مثلاً ندیم قاسمی کا "آخری سجدہ"

تو مرے خلوص کا واسطہ، مری آرزو مری آس آ!

مری بات سن۔ مری بات سن بھر پاس آ مرے پاس آ

۴۲ء کی منتخب غزلیں نگارستان بک ایجنسی دہلی نے شائع کی ہیں اس میں پرانے شعرا بھی ہیں۔ اور نئے بھی۔ انتخاب کرنے والے کا مذاق سخن بہت سلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

۴۵ شعرا کی غزلوں کا یہ انتخاب جس میں غزل اور نظم گو شعرا دونوں شامل ہیں چوٹی کی چیز ہے۔ غزل کا منفائی اخلاقی اور سوز و گداز کا پہلو اس انتخاب میں زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً جذبی کا یہ شعر ؎

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے

میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

اور روش کا

دور پہنچا میرا قصہ کہ بڑی حسرت سے شکوہ کرتی تھی فلک سے شفق شام ان کا

اس مجموعہ میں سے فراق کے دو شعر سنئے۔

تمام صبر و رضا ہوں تمام مجبوری　　مگر خدا کی مشیئت سے کھیل سکتا ہوں
تری جبیں سے ہیں مانوس انگلیاں میری　　طلوع صبح قیامت سے کھیل سکتا ہوں

سیماب کہتے ہیں

نہیں اب انقلاب آباد میں مُردوں کی گنجائش　　جئے گا وہ جسے حاصل مجال زندگی ہوگی

نظم کے تین مجموعوں کے مقابلے میں غزلوں کا ایک مجموعہ ایک اور بات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے شعرا نے احساسات کی ترجمانی کے لیے زیادہ تر نظم کو چنا ہے جس طرح نظم کے مجموعوں میں نوجوان شاعروں کے دوش بدوش کہن سال شعرا بھی موجود ہیں۔ اسی طرح غزل کے مجموعہ میں بھی استادوں سے لے کر مبتدی تک دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر نوجوان شعرا کا کلام ہی بدلتے ہوئے زمانہ اور نئے آثار کی ترجمانی کرتا ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے تجربوں ہی کا نام زندگی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نئے تجربات خواہ وہ موضوع کے ہوں خواہ ہیئت کے ان کے نبھانے کے لیے نوجوان شاعروں ہی کی بے باکی بروئے کار آسکتی ہے۔

ایک اور زاویہ سے بھی ان مجموعوں پر نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ شعرا کی خود منتخب کردہ "میری بہترین نظم" کے مرتب محمد حسن عسکری ہیں۔ وہ خود بھی مختصر افسانہ کی دنیا میں نام پیدا کرچکے ہیں۔ "۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں" ادبا، اور شعرا کی ایک انجمن نے پیش کی ہیں اور باقی دو مجموعے یعنی منتخب نظمیں اور منتخب غزلیں کسی فرد یا جماعت کی ذہنی حمایت سے

محروم ہیں۔ اس کا اثر انتخاب پر کیا پڑا ہوگا۔ اس کے بارے میں مفصل طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ کہے بغیر ہی نہیں رہا جاتا کہ ان آخری دو مجموعوں میں تنقیدی ذمہ داری کا احساس اتنا نہیں جتنا دوسرے مجموعوں میں ہے۔ "میری بہترین نظم" میں کتاب کے آخر میں شاعر کے خود نوشتہ حالات بھی شامل ہیں۔ اور یوں یہ مجموعہ صرف ایک بیاض شعری نہیں بلکہ سوانحی اعتبار سے بھی توجہ کے لائق ہے۔

تعلیم دیہات کا ایک مختصر خاکہ

تعلیم دیہات کا مسئلہ ہماری ترقی کے نقطۂ نگاہ سے اتنا ضروری ہوگیا ہے اور روز بروز ہوتا جاتا ہے کہ اس پر ہر شخص کی توجہ ہونی چاہیئے جو دیہات میں اس تاریکی کو جو عام لوگوں پر طاری ہے دور کرنا چاہتا ہے اور اس طرح ہمارے دیہات کے بھائیوں کو قومی زندگی میں وہ حصہ دینا چاہتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں اور جو ملک کا قانون ان کو دے چکا ہے لیکن جس کو وہ ابھی صحیح طور پر استعمال کرنا نہیں جانتے۔

آجکل معمولی گاؤں میں عموماً پرائمری درجہ چار تک کے اسکول ہیں اور بڑے گاؤں میں مڈل اسکول ہیں۔ جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے زیر انتظام ہیں۔ ان مدرسوں میں حساب ہندی۔ اردو اور جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے کہیں کہیں ورزش اور کچھ کھیل مثلاً فٹ بال یا ہاکی بھی رائج ہیں۔ نیچر اسٹڈی بھی کسی کسی مدرسے میں داخل نصاب ہے۔ تعلیم کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے۔ جو تقریباً ہر سال بدلتی رہتی ہیں۔ اور جن کے چناؤ میں عموماً ذاتی مفاسد و اغراض اور ذاتی تعلقات بڑا حصہ رکھتے ہیں۔

دستکاری زراعتی تعلیم اور فارمنگ وغیرہ ایک فی صدی بھی اسکول کے نصاب میں داخل نہیں ہے۔ دیہات میں جو تعلیم عموماً دی جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ زندگی کے شعبوں میں کارآمد نہیں ہوتی۔ اور نہ دیہاتی زندگی کے شعبوں میں کارآمد ہوتی ہے - اور نہ دیہاتی زندگی کے شعبۂ نصاب تعلیم میں داخل ہیں

اس طرح جو خلیج درمیان میں حائل ہے وہ بہت وسیع اور خطرناک ہے۔ پھر موجودہ طرز تعلیم سے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد درجہ چار تک بھی نہیں پہونچتی۔ اور وہ درمیان ہی مین مدرسہ چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتی ہے۔ طرز تعلیم کے دلچسپ نہ ہونے کا دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول سے نکلنے اور دیہاتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مدرسوں میں جو پڑھا لکھا تھا اسکا اثر رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری کچھ تو طرز تعلیم پر ہے۔ اور کچھ ان . . ذرائع کے میسر نہ ہونے پر جن کی وجہ سے جو تعلیم مدرسوں میں ملی ہے۔ ان کی تکمیل گھر پر ہو سکے۔ گاؤں میں نہ کتب خانہ ہیں نہ اخبار مل سکتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی دیہاتی زندگی اور تعلیم میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم از کم بیس فیصدی ایسے لوگ جنہوں نے درجہ چار بھی پاس کر لیا تھا۔ دس بارہ سال بعد حساب تک نہیں لکھ سکتے اور اپنے لگان کا حساب بھی پٹواری یا اسکول کے ماسٹر صاحب سے لکھواتے ہیں۔

گاؤں کے مدرسوں کے استاد بدقسمتی سے بہت معمولی قابلیت کے ہوتے ہیں اس میں ان بیچاروں کا تو کوئی قصور نہیں لیکن ان کا اثر ہماری دیہاتی زندگی پر اچھا نہیں پڑتا۔ ان کی دماغی نشوونما اگر ہوتی بھی ہے تو بہت معمولی۔ انہیں عام طور پر نہ ولولہ ہوتا ہے۔ نہ جوش جس فضا میں وہ رہتے ہیں۔ وہ اس کی ذمہ دار ہے انہیں نہ قوت عمل ہوتی ہے۔ نہ خیالات جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے مدرسے

جن میں زندگی کی تڑپ پائی جانی چاہیئے۔ ان میں نیم مردہ دماغ ملتے ہیں پچاس مدرسوں میں شاید کہیں ایک پُرجوش استاد مل سکے۔ ٹرینڈ استادوں کا بھی اب بڑھ رہا ہے لیکن ٹرینڈ استادوں میں بھی وہ بات نہیں پائی جاتی جو دیہاتی تعلیم کے لیے ضروری ہے یعنی جوش عمل اور تخیل۔ جو ٹریننگ ان کو ملتی ہے۔ وہ ان کو کتابیں پڑھانے کے لیے شاید زیادہ موزوں کردے۔ ورنہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوتا

ہم تعلیم بالغان کی طرف تو کبھی متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ اور اگر ہوئے بھی تو مشکلات ایسی حائل ہیں کہ تعلیم بالغان کی کوئی اسکیم قابل عمل نہیں ہوسکی۔ دیہات میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دینا بھی غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ترقیٔ دیہات کی ہر اسکیم میں اس مسئلہ کو جو ممتاز حیثیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ چھوٹی لڑکیاں بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ مدرسہ چھوڑ دیتی ہیں اور اس کے بعد ان کے تعلیم جاری رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔

انتظامی معاملات میں بھی وہ ترتیب نہیں ہے جو ہونی چاہیئے۔ مثلاً استادوں کا تقرر ظاہر میں کسی خاص اصولوں پر ہو۔ لیکن عموماً اسمیں سفارش۔ ذاتی تعلقات اور مذہبی تعصب کو بہت دخل ہوتا ہے۔ استاد بھی لوکل بورڈس کی سیاسیات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اور پارٹیوں کے آلۂ کار بنائے جاتے ہیں۔ تبادلوں کی تلوار ان کے سروں پر ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے جسکی وجہ سے نہ کوئی اسکیم پوری طور پر کارگر ہوسکتی ہے

اور نہ اسکولوں میں وہ ذاتی اثر جس کی مدرسوں میں ضرورت ہے کام میں لایا جا سکتا ہے
پھر دیہاتی اسکولوں کی تعلیمی پالیسی عموماً ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خود
اس کی ضروریات سے ناواقف ہیں۔ اور جو لوگ اس سے واقف ہیں۔ اُن سے تعاون
عمل کے خواہشمند نہیں۔ اس پالیسی کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔ کہ تعلیم پر باوجود لاکھوں روپیہ
صرف ہونے کے دیہات میں جو حالت دس سال قبل تھی۔ اب بھی صورت حال
اس سے زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے تاکہ ترقی اور اصلاح دیہات صحیح معنوں میں
ہوسکے۔ اور ہمارے بھائی جو دیہات میں رہتے ہیں اور ہمارے لئے اتنی محنت سے کاشتکاری
جیسا صبر آزما کام کرتے ہیں۔ ان کو بھی ہماری طرح معاملات سمجھنے اور ان کے حل
کرنے میں رائے دینے کی صلاحیت پیدا ہوجائے اور اپنی تعلیم سے وہ اپنی زندگی کو بہتر اور
زیادہ کارآمد بنا سکیں۔

اس کے لئے ہم کو طرز تعلیم میں تبدیلی کرنی لازمی ہے۔ نصاب تعلیم میں تبدیلی ضروری
ہے۔ اور استاد بدلنے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنا طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کی تبدیلی۔
پہلا قدم لڑکے اور لڑکیوں اور بالغوں کے لئے ایک ابتدائی تعلیم کا لازمی
قرار دیا جانا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ترقی دیہاتی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہو تو ہم کو
بالغوں کو بھی تعلیم دینا اور ان کو گاؤں کا کارآمد رکن بنانا لازمی ہے اسی طرح لڑکیوں اور

عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دینا گویا ترقی دیہات کے سلسلہ میں ایک خاص خدمت انجام دینا ہے۔ لڑکے لڑکیوں اور بالغوں کے لیئے ابتدائی تعلیم کو ضروری بنانے کے لئے کافی ہمت کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ترقی و اصلاح دیہات کا کوئی پروگرام بغیر ابتدائی تعلیم کے جبریہ اور لازمی قرار دیئے جانے کے ممکن ہی نہیں ہے ابتدائی تعلیم کو جبریہ اور لازمی قرار دینے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس بات کو پسند نہ کریں لیکن مخالفت اگر ہوئی تو وقتی ہوگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو جائیگی۔ یہ کام جتنا بڑا اور عظیم الشان ہے۔ اس کے دیکھتے ہوئے ابتدائی جبریہ تعلیم کو کوئی ایسا دشوار یا دقت طلب امر نہیں سمجھنا چاہیئے۔

تعلیم انگریزی میں ہو یا اُس زبان میں جو ملک کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ دیئے جانے کے متعلق تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دیئے جانے کے خلاف شاید ہی کبھی کوئی آواز بلند کی گئی ہو۔ طرز تعلیم میں عملی اصولوں اور طریقوں کی بڑی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ گرام سدھار کی تعلیمی اسکیم میں عملی اصولوں اور طریقوں کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہی استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ہر سرکل میں اسکولوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا فارم مویشیاں ہونے سے عملی تعلیم دی جاسکیگی۔

اور تعلیم کے عملی اصول کام میں لائے جاسکیں گے جن سے تعلیم کی بنیادیں مضبوط اور پائدار ہوسکینگی۔ بالغوں کے لئے چھ چھ ہفتہ کی تعلیمی اسکیمین بنانا ماہرین تعلیم کا فرض ہے۔ یو۔ پی میں الہ آباد کے قریب پنجاب میں موگھا میں اور اور سی۔ پی۔ یمں۔ پیریا میں اس قسم کی اسکیمین بنائی گئی ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی مکمل تعلیمی اسکیم ایسی بن چکی ہے۔ جو تمام ملک میں رائج ہوسکے لیکن جو کام اب تک کیا جاچکا ہے۔ وہ کافی امید افزا ہے۔ اب ہمارے ماہرین تعلیم کو بجائے علمی مضامین پر کتابیں لکھنے اور تعلیم کے پیچ در پیچ مسائل پر بحث کرنے کے چھ چھ ہفتہ کی تعلیمی اسکیم وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اور اپنی تمام تر توجہ اس طرف مبذول کرنی چاہئیے۔ اگر ہمارے ماہرین تعلیم اس طرف توجہ کریں تو تعلیمی اسکیمین بن سکتی ہیں۔ جو دیہات میں ابتدائی تعلیم کی صورت میں بالغوں تک پہونچائی جاسکیں تاکہ ان کو معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ رکھنا آجائے۔ تعلیمی اسکیموں کی ضرورت اس لئے ہے کہ گاؤں کے بالغ مرد اور عورت تھوڑے ہی عرصہ میں اس قابل ہوجائیں کہ ان کو زراعتی معاملات کی تعلیم دی جاسکے۔

بالغوں کے مدرسوں میں تفریح اور تعلیم دونوں ہونی چاہئیں۔ تاکہ بالغ مرد اور عورتین آسانی سے ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرسکین۔ ان کو مدرسہ جانا عذاب نہ معلوم ہو۔ بلکہ شوق سے شام کو مدرسوں میں جاکر تعلیم بھی حاصل کرسکیں اور اس

کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح بھی ہوتی رہی۔

یہ سوال باقی رہتا ہے کہ استاد کہاں سے ملیں گے اور اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے یہ سوال بہت ہی اہم ہے۔ اسکیم اگر ایک صوبہ میں بھی رائج کی جائے تو ہزاروں استادوں کی ضرورت پڑے گی تعلیم یافتہ طبقہ میں جنگ کے بعد بیکاری کے امکانات ہیں جن سے لوگوں کو پریشانی ہے۔ اس اسکیم کو چلانے کے لئے استاد اس تعلیم یافتہ طبقہ سے لئے جائیں گے۔ اس سے بیکاری بھی کم ہوگی اور ترقی دیہات کے لئے ہم گاؤں والوں کو تیار بھی کر سکیں گے کیونکہ جب تک گاؤں والے یہ نہ سمجھیں کہ گرام سدھار کی اسکیموں کا کیا مطلب ہے۔ تب تک وہ ان پر عمل نہیں کر سکیں گے اور اگر بادل ناخواستہ انھوں نے ان پر عمل کیا بھی تو بھی وہ جوش اور ولولہ اس میں نہ ہوگا جس کے بغیر ترقی دیہات کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کا دیہات کے مدرسوں میں کام کرنے سے ایک طرف تو گاؤں والوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ وہ اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ ان کے شہروں کے رہنے والے بھائی ان کے ساتھ دلی ہمدردی کرنا چاہتے ہیں اور دوسری جانب تعلیم کا تمام ماحول بدل جائے گا۔ بیکار تعلیم یافتہ لوگوں کو اس اسکیم میں کام کرنے سے قربانی کرنی پڑے گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ گورنمنٹ ان لوگوں کو کچھ تنخواہ دے گی ہی اس کے علاوہ گاؤں والوں کی بھی امداد کی ضرورت ہوگی

استادوں کے رہنے کے لئے مکان گاؤن والوں کی خوشی سے دینا چاہیئے جہاں تک
ممکن ہوگا ؤن میں ایسے استاد بھیجے جائیں۔ جو خود نابالغوں اور لڑکوں کی تعلیم کی
طرف توجہ دین۔ اوران کی بیویاں عورتوں اور لڑکیوں کو پڑھائیں۔ اس طرح روپیہ
بھی کم خرچ ہوگا۔ اور استادوں کو آسانیاں بھی میسر آسکیں گی۔ عورتوں کی تعلیم میں ضلع
کے حکام کی تعلیم یافتہ بیویاں بہت کچھ حصہ لے سکتی ہیں۔ اسی طرح سیدھی سادی
ہندوستانی میں لکھی ہوئی پر اثر نظمیں شاعروں سے مدرسوں میں پڑھوائی جا سکتی
ہیں۔ اور لوگوں میں اس طرح جوش عمل پھیلایا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی ہم کو
استادوں کی زیادہ عزت کرنا ضروری ہے۔ استادوں کو نیچی نظر سے نہیں دیکھنا
چاہیئے۔ بلکہ ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ اور اس طرح ان کا رتبہ جس کے وہ ہماری قومی
زندگی میں جائز طور پر حق دار ہیں ان کو دینا چاہیئے۔ اس سے بہتر طبقہ کے لوگ
کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے۔ اور اخلاق کی صحیح تعلیم اسکول کی تعلیم کے علاوہ لوگوں
کو ان سے مل سکیگی۔ نصاب تعلیم ایسا بنانا چاہیئے جس سے دیہاتی لوگوں کو فائدہ
پہونچ سکے۔ اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اچھے کاشت کار اور اچھے گاؤں والے
بن سکیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم ایک خاص عمر تک۔ تو ایک ہی ساتھ ہو سکتی
ہے۔ اور اس کے بعد علیحدہ علیحدہ۔

لڑکوں کے اسکول میں ہندوستانی زبان حساب جغرافیہ پڑھانا ضروری ہے

اس کے علاوہ دست کاری صحت صفائی۔ مویشیوں کی نگہداشت صفائی بیماری علاج۔ کھاد اور کھیتی کے متعلق معلومات ڈائری فارمنگ۔ فرسٹ ایڈ۔ قانون اراضی وغیرہ نصاب میں داخل ہونا چاہیئے۔ یہ مطلب نہیں کہ ایک دم لڑکوں پر اتنا بار ڈال دیا جائے۔ نصاب تعلیم جب تیار کیا جائے۔ تو اس میں یہ مضامین اور اسی قسم کے اور مضامین جن سے تمام گاؤں والوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ ضرور ہونے چاہئیں تاکہ اسکول سے فارغ ہو کر وہ کھیتی بہتر طریقے سے کر سکیں۔ اور اسطرح زندگی اپنے باپ دادا سے بہتر اور زیادہ آرام سے گذار سکیں۔ لڑکوں کی عمر اور درجہ کے مطابق یہ مضامین اُن کو پڑھائے جائیں گے۔ اور جوں جوں وہ بڑے درجہ میں پہونچتے جائیں گے۔ زیادہ معلومات ان کو دی جا سکیں گی۔ لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ تو اوپر کے مضامین اور ان کے علاوہ گھر کی نگہداشت۔ صفائی۔ فرسٹ ایڈ۔ زچگی کے کام کی ٹریننگ وغیرہ بھی ہونی چاہیئے جس کی ضرورت پر کچھ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس تعلیم کے لئے گشتی اسکول بنائے جا سکتے ہیں یہ گشتی اسکول بیس بیس گاؤں کو مرکز بنا کر ہر مرکز پر ایک ماہ رہ سکتے ہیں۔ اور وہاں ان شعبوں میں تعلیم دے سکتے ہیں اس کے علاوہ بالغوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا۔ ہم یہ تو چاہتے ہی ہیں کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورت بہتر اور زیادہ کارآمد زندگی بسر کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہم موجودہ پود کو بغیر پانی کے نہیں چھوڑ سکتے

تعلیم بالغان کے سائنٹفک اصولوں پر ہم کو کاربند ہونا ہے۔ اور اُن سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اول تو ایسی اسکیمیں ہر بالغ مرد اور عورتوں کے مدرسے میں عمل لائی جائیں۔ اور اس کے بعد اوپر کا کورس آہستہ آہستہ ان کو پڑھایا جائے یہ ایک دن کا کام نہیں ہے۔ لیکن طرز تعلیم کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنانے سے لوگ خود بخود ان مدرسوں میں آئیں گے اور تعلیم حاصل کریں گے۔ بالغوں کے مدرسے رات کو ہونے چاہئیں۔ اور ان میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر دن بھر کی خبریں، موسم کا حال اور زراعت کے متعلق کارآمد باتیں بتلائی جانی چاہئیں جس سے ان کی جنرل تعلیم بھی ہوتی رہے۔ اور اُن کا دائرہ معلومات وسیع ہوتا جائے۔

تعلیم دیہات کی اسکیم کو جتنا سستا بنایا جا سکے اتنا ہی اس سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کچھ روپیہ تو ہمیشہ گورنمنٹ بجٹ سے ملے گا۔ اور کچھ روپیہ لوکل بورڈ سے۔ روپیہ ملنے کے یہ دو ذریعہ تو ہیں ہی لیکن ان کے علاوہ یہ ممکن ہے کہ مغلوں کے زمانہ کا پرانا دستور جس سے مسجدوں اور مندروں کو زمینیں دی جاتی تھیں دوبارہ رائج کر دیا جائے۔ اور ہر حلقہ میں کچھ زمین بطور معافی کے اس حلقہ میں تعلیم دیہات کے کام کے لئے دیدی جائے۔ اس کی تمام آمدنی حلقے کے مدرسوں میں تقسیم ہو سکتی ہے

اس کے علاوہ دستکاری کے مدرسوں کی بنائی ہوئی تمام چیزیں گورنمنٹ کو لازمی طور پر خریدنا چاہئیں۔ اور یہ روپیہ مدرسوں میں تعلیم کے لئے دینا چاہیے۔

ان چیزوں کو بازاروں میں بیچنے کا کام گورنمنٹ ایجنسیاں کرسکتی ہیں۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ تعلیم دیہات کی اسکیم کا ہے جسکے عمل میں آنے سے ہمارے گاؤں والے اپنی بھلائی اور برائی کی باتیں سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایک بہتر زندگی بسر کرسکتے ہیں یہ کام آسان نہیں ہے۔ لیکن کرنے کے قابل ضرور ہے۔

ریڈیو کی تقریریں

ریڈیو کا مقصد عموماً تفریح طبع سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی غلطی بھی نہیں لیکن ریڈیو کو صرف تفریح طبع کا ذریعہ بنا لینا اہم غلطی ہے۔ باوجود اس کے بیشتر سننے والے اس غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ریڈیو کے پروگراموں میں وہ تقریروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کا مطلب نہیں کہ تقریریں واقعی کوئی اہمیت نہیں رکھتیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پروگرام بنانے والے بھی صرف خانہ پوری کیلئے تقریروں کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اگر گانے کے پروگرام دیکھئے اور ریڈیو آرٹسٹوں کی فہرست ملاحظہ کیجئے تو ظاہر ہوگا کہ لکھنؤ کے آرٹسٹ لاہور تک اور دہلی کے آرٹسٹ کلکتہ تک جا کر گانے کے پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں لیکن تقریروں کے پروگرام میں یہ تنوع آپ کو کم نظر آئیگا۔

میں اس مختصر مضمون میں تقریروں اور تقریر کرنے والوں کو چھوڑ کر صرف اصولی بحث کرنا چاہتا ہوں۔ لکھنؤ اسٹیشن سے علمی ادبی سیاسی معاشرتی مذہبی تقریریں برابر نشر ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان تقریروں میں سننے والوں کے معیار ذہنی کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقریریں بعض اوقات عام معلومات سے بھری ہوئی ہوتی ہیں جن کا ایک بلند پایہ مضمون یا تقریر میں شامل کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ ان میں وہ نکات نہیں پائے جاتے جو ایک خاص معیار قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریر لکھنے والا سننے والوں کو اپنے مضمون سے بالکل ناآشنا سمجھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف وہ لوگ ہی تقریروں کو سنتے ہیں جن کو علم و ادب سے شغف

ہوتا ہے۔ اور جو کسی خاص موضوع کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض مضامین اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ ان کو ایک تقریر میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یا تو تقریر کا وقت بڑھا دینا چاہیئے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس قسم کی تقریروں کو کئی قسطوں میں نشر کرنا چاہیئے۔ یہ قسطیں یکے بعد دیگرے جس قدر جلد ممکن ہو سکے نشر کی جائیں تاکہ تسلسل نہ ٹوٹے ایسی تقریروں میں اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے کہ سننے والوں کو موضوع سے کافی واقفیت ہو جائے اور مضمون تشنہ نہ رہے۔

ادبی تقریروں میں زیادہ تر صرف اُردو اور ہندی کے شاعروں پر تبصرہ ہوتا رہتا ہے۔ انگریزی ادب پر ہندوستانی میں تقریریں کم ہوتی ہیں۔ انگریزی ادیبوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا اور سننے والوں کو ان کے حالات زندگی اور خصوصیات بتلانا ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ جو اثر انگریزی ادب نے ہندوستانی ادب پر ڈالا ہے۔ اس کی بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نیچرل اور قومی شاعری اور نظموں کا فروغ انگریزی شاعری ہی کا مرہون منت ہے۔ اسی طرح ناول۔ افسانہ نگاری اور پولٹیکل مضامین بھی انگریزی تعلیم و تعلّم کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا انگریزی شاعروں اور نثر نگاروں کے متعلق زیادہ تعداد میں بلند پایہ تقریریں اگر ہوں تو تعلیمی پہلو سے وہ بہت قیمتی اور کارآمد ثابت ہوں گی۔

اس کے بعد زبان کا مسئلہ ہے۔ اُردو اور ہندی کے مرکب سے جو ہندوستانی وجود میں لائی گئی ہے اِس میں زبان کے حسن و قبح کا سوال ہی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے

تقریروں کی زبان ادبی اور عام فہم ہونی چاہیئے! ور ایسے الفاظ چاہے وہ سنسکرت کے ہوں یا فارسی اور عربی کے استعمال میں لائے جانے چاہئیں جو جزو زبان ہو گئے ہیں۔ اور سب لوگ ان کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ تقریروں کو روزانہ کی بول چال میں لکھنا کسی طرح مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زبان میں مشکل الفاظ کی بھرمار نہ ہونی چاہیئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زبان کو اس کی خوبیوں سے معرا کر دیا جائے۔

ریڈیو کے منتظمین کو علاوہ اُن افراد کے جو ایک اعلیٰ ادبی حیثیت رکھتے ہیں اُن لوگوں کو پروگراموں میں حصہ لینے کا موقع دینا چاہیئے جو اتنے مشہور نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ اچھا مواد نہ مہیا کر سکیں تو بہرحال ان کے مضامین کو رد تو ہر وقت کیا ہی جا سکتا ہے بلشیتر تعلیم یافتہ اشخاص اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اور ایک خاص قسم کا ذوق بھی۔ اس لئے انہیں مواقع دینے سے کچھ ایسی چیزیں ملیں گی۔ اور ایسے رنگا رنگ مرقع سامنے آئیں گے جن سے آنکھیں نا آشنا ہیں۔

جہاں تک تقریروں کے موضوعات کا تعلق ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے منتظمین کی وسیع نظر کی مثال آپ ہیں۔ مزاحیہ تقریریں بہت ہو چکیں۔ ادب کو سستی تقریروں کی ضرورت نہیں۔ مزاحیہ نگاروں کے آرٹ کو خراب کرنے کی ذمہ داری ریڈیو کے سر آئیگی اگر اُن سے مزاحیہ مضامین اسطرح لکھائے جائیں گے جس طرح پچھلے زمانہ میں ایک استاد ایک ردیف اور قافیہ میں موزوں شعر کہا کرتا تھا۔

جنگ کی موجودہ فضا میں اس امر کی ضرورت ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر زیادہ سے زیادہ معلومات عوام کو پہنچائی جائیں اس سلسلہ میں چند اشخاص برابر ریڈیو پر بولتے رہتے ہیں۔ اور ان کی تقریروں میں جنگ کی رفتار پر یقیناً اچھا تبصرہ ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اس موضوع کو اور وسعت دی جاسکے جس کی ضرورت ہی نہیں بلکہ مانگ بھی ہے۔ تو بہت اچھا ہو۔

ریڈیو پر ادبی مضامین پر بلند پایہ تقریریں کم سننے میں آتی ہیں بہت مرتبہ پروگرام میں ایک مضمون دیکھ کر بہت اشتیاق سے اس دن کا انتظار کیا جاتا ہے۔ جس دن کسی شگفتہ مضمون پر کوئی تقریر ہونے والی ہے جب تقریر ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بالکل سطحی باتیں ہیں۔ اگرچہ مضامین اور مقرر دونوں سے اس کی توقع نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر شگفتہ مضامین پر ریڈیو اسٹیشن سے کچھ اور بلند پایہ تقریریں نشر ہوں تو ایک طرف تو وہ ایک معیاری طبقہ کی تشنگی دور کرینگی اور دوسری طرف عوام کے مذاق کو درست اور بلند کرنے میں مفید ثابت ہونگی۔

ریڈیو کی تقریریں اگر ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کریں گی اور اگر ہم کو اس مضمون پر کچھ اور سننے اور پڑھنے کا شوق نہیں دلائیں گی۔ تو ان کا حشر یہ ہوگا کہ وہ فضا میں گم ہو جائیں گی بجائے اس کے کہ وہ ہمارے دل اور دماغ میں پیوست ہوں۔

عمر خیام اور ایک غم پسند شاعر

شاعر

رات کیا میرے لیۓ پیغامِ عشرت لائیگی
اُن کی زلفِ پرشکن سے یا تو وحشت لائیگی
یا وہ اُن کے آئینے سے میری حیرت لائیگی
رات کیا میرے لیۓ پیغامِ عشرت لائیگی

ہاتفِ غیبی۔

جہاں آباد کی یہ سرزمین معلوم ہوتی ہے
زمین کچھ رشکِ خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے
کوئی غم آشنا شاعر یہاں کچھ گنگناتا ہے
صدا اِسکی بہت اندوہگیں معلوم ہوتی ہے

شاعر

تجھ کو دردِ عشق کی شاید دوا معلوم ہو
تجھ کو رازِ زندگی رازِ بقا معلوم ہو

ہاتفِ غیبی۔

چشمِ دل کھول ذرا وادیٔ ایراں میں چل
عشق کی بزم میں چل حسن کے ایوان میں چل

(وقفہ)

دیکھ اے شاعرِ حسن‌ زیں یہ ہے عُمر یہ نکتہ بین
کریگا تجھ پہ یہ دلنشین حلاوتِ غمِ آتشین

عمر خیام

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما — کے رندِ خراباتی ہمپانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ زمے — زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

شاعر

کیوں التزامِ ساغر و مینا کرے کوئی
اس چشمِ سحر کار کو دیکھا کرے کوئی
کیوں بھر نہ لے نگاہ میں خود جلوہ ہائے طور
کیوں آرزوئے شاہدِ رعنا کرے کوئی
مانا کہ وہ نقاب اٹھائے ہوئے ہیں آج
کیوں اپنے ذوقِ دید کو رُسوا کرے کوئی

عمر خیام

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است
نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بے خودی برآرم نفسے
مے خوردن و شاد بودنم زیں سبب است

شاعر

ہے دل کو پھر فریبِ تمنا کی آرزو
یعنی نوازشِ غمِ پنہاں کی آرزو
پھر آگئی بہارِ جنوں پھر سوا ہوا
ہے پرسشِ جراحتِ مژگاں کی آرزو
وحشت کو پھر طوافِ بیاباں کا شوق اٹھا
پائے جنوں کو خارِ مغیلاں کی آرزو

چند دلچسپ مطبوعات

(۱) ہمارا ادب اور ہماری زندگی۔ میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں لاہور

(۲) مضامین رشید، رشید احمد صدیقی صاحب مکتبہ جامعہ دہلی

(۳) شمیم۔ فیاض علی صاحب، انڈین پریس۔ الہ آباد

میاں بشیر احمد ہمارے اعتدال پسند ادیبوں میں سے ہیں انکے مضامین "جو طلسم زندگی" کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں، ملک میں قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں تخیلی آرٹ بہت بڑی حد تک کارفرما ہے "ہمارا ادب اور ہماری زندگی" میاں بشیر احمد صاحب کا وہ مضمون ہے جو شملہ میں انجمن اردو پنجاب کے ایک ادبی جلسہ میں آنریبل مسٹر عبدالحئی وزیر تعلیم پنجاب کی زیر صدارت پڑھا گیا تھا۔ اس مضمون میں میاں صاحب نے دکھایا ہے کہ ہمارا ادب کس طرح ہماری زندگی کا آئینہ دار رہا ہے بشیر احمد صاحب کا کہنا بجا ہے کہ ہمارے کئی نوجوان شاعر عام انسانی اور قومی زندگی کے نئے خیالات کا نئے طریقے سے پرچار کر رہے ہیں۔ نثر میں بھی اصلاحی اور انقلابی خیالات کی کمی نہیں۔ بعض مصنفوں کی ظرافت وہ کام کر رہی ہے جو کبھی اصلاح پسندوں کی متانت کیا

کرتی تھی۔ مثال کے طور پر دیکھئے تلک بیما کا "اللہ میاں" فرحت اللہ بیگ کا "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر" اور بخاری کا "کتے"۔ ساتھ ہی بے قافیہ نظمیں، ریڈیو کے نئے ڈرامے، ہندوستانی زندگی کے طبعزاد افسانے، اردو ادب کی نئی روش کو ظاہر کرتے ہیں بشیر احمد صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ وہی ادب زندگی کا صحیح آئینہ دار ہوگا جو اسی طرح مسلسل ترقی کا ثبوت دیتا رہے اور جس کا منتہائے کمال یہ ہو کہ اسکے جامِ جہاں نما میں تمام پرانی اور نئی لیکن بالخصوص نئی، چیزوں کا گنگا جمنی عکس نظر آئے۔

مکتبہ جامعہ دہلی نے مضامینِ رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع کیا ہے کتاب کا گردپوش جاذبِ نظر ہے اور اسکی صفائی جاذبِ توجہ۔

رشید احمد صاحب اردو میں ظرافت نگاری کے فن کے ایک کہنہ مشق استاد ہیں۔ انکو اردو کا چھوٹا موٹا ہلیر بیلک کہنا غلط نہ ہوگا۔ وہ اونچے پایہ کے نثر نگار ہیں اور اپنے مخصوص اندازِ جدید کی وجہ سے کافی شہرت کے مالک۔ اس کتاب میں انکے اٹھارہ مضمون یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ رشید صاحب کے مضامین میں لوکل کلر (مقامی رنگ) بہت زیادہ ہے اور اگر آپ علیگڑھ نہیں گئے ہیں اور آپ نے بدقسمتی سے "کچی بارک" نہ دیکھی ہے اور نہ اسکے تذکرے سنے ہیں، یا آپ "جانیلزم" جیسے جامع لفظ سے ناآشنا ہیں یا "مغالطہ" کے صحیح معنی نہیں جانتے تو آپ کو مضامینِ رشید میں وہ لطف نہیں آئیگا جو آنا چاہئے۔

مضامین کی دنیا محدود سی ہے۔ "گھاگس" جیسے معنی خیز نام سے اگر عام لوگ وہ حظ نہ اٹھا سکیں جو مصنف چاہتے ہیں تو ہم کو تعجب نہ ہوگا۔

یہ درست ہے کہ رشید صاحب کے فکاہات کا ہدف کبھی کوئی "بلاک [illegible] دوست ہے۔ جیسے "نہ رزق ہے نہ موت" کبھی کوئی ایسا مجتہد العصر صاحب طرز ادیب ہے جو "کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں" والا پرچم استقلال اڑاتا ہے کبھی دلدادگان آرٹ" ہیں جن کے لئے اپنی کمزوریاں بھی آرٹ، اور دوسروں کی خوبصورت بیویاں بھی آرٹ! کبھی کوئی "آمادۂ شہادت" "شرعی مسلمان" ہے یا نعرۂ "یا حیدر یا حسین" لگانے والے اسلامی عوام کالانعام، یا "تنبیہ الغافلین ہند" مولانا! کبھی "گاندھی جی کی جے" بولنے والے کانگریسی والنٹیر ہیں یا کبھی دیہاتیوں اور کسانوں کی "تقدیر ارضی" کی کتابت کرنے والا "صاحب قلم پٹواری! کبھی ریل کی ہم سفر وہ "مارواڑی عورتیں" ہیں جن کے لطیف رنگ پیکر ہائے جمال "ٹائمز آف انڈیا" کی زینت ہوتے ہیں اور جو فارسی کاف سگانہ "گوشت، گندگی، گہنا" کی طرفہ معجون ہوا کرتی ہیں اور کلچر سے بعد، لیکن لطف میں کسی سے کم نہیں۔ خود رشید صاحب کی بعض نادر "آپ بیتیاں" ہیں۔ "مضامین رشید" ایک فن کار کا ادبی کارنامہ ہے جس میں دلدادگان ادب و مزاح کو دلچسپ مرقع نظر آئیں گے۔

فیاض علی صاحب مصنف "شمیم" کا دوسرا ناول "انور" انڈین پریس الہ آباد نے شائع
کیا ہے۔ سرورق کی رنگین تصویر دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ناول میں حسن و
عشق کی نیرنگیوں کی تصویریں دکھلائی گئی ہونگی۔ مصنف نے کچھ حسین صورتیں یکجا کی
ہیں۔ کچھ رنگین سنسنی پیدا کرنے والے حادثات، کچھ لطیف مباحثے، کچھ دلچسپ مناظرے
کچھ دل کے راز و نیاز کچھ حسن و محبت کی دلفریبیاں، رعنائیاں، جادو کاریاں اور ان
سب سے یہ ناول ترتیب دیا ہے۔ فیاض علی صاحب کا ناول خیالات و جذبات
کی ایک صنم خانہ اور دلکی فتنہ سامانیوں کا ایک آئینہ خانہ ہے اور ہماری موجودہ
تہذیب کی زندگی کے ایک روحانی باب کا فوٹو۔ فیاض علی صاحب نفسیات کے
اچھے نباض نہیں معلوم ہوتے لیکن جذبات اور تخیلات کے بیان میں انھوں نے
کمال کیا ہے۔ اس ناول میں بھی وہی ہے جو بہت سے ناولوں میں ہوتا ہے،
یعنی ایک محبت کی داستان انور حسن کا ایک غیر معمولی مجسمہ ہے۔ طبیعت میں ایثار
خودداری، شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کا دل موم سے زیادہ نرم ہے اور
وہ شیطان صفت ڈاکٹر شیرازی کو ایسے وقت جب اس کی زندگی انور کے رحم و کرم پر
ہے صرف زبانی معافی پر بخش دیتا ہے۔ ڈاکٹر شیرازی اور اُن کی بہن زہرہ جمال نہایت
عبرتناک موت مرتے ہیں جو انکی بد افعالیوں کا انجام ہے۔ انور کے دوست ممتاز ہیں
جنھیں غلو! جیسی بیوی کو کھونے کے بعد محبت کے لطیف پہلوؤں پر ایک محققانہ نظر

ڈال سکنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ مہ جبین ایک باغی لڑکی ہے اور کشور سلطانہ ناول
کی ہیروئن زہرہ جمال موجودہ تہذیب کی ایک خطرناک عورت۔ ناول میں لاتعداد
اشعار ہیں۔ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک کیرکٹر کو اسقدر اشعار یاد ہوں
اسی طرح ناول کے بعض بعض کیریکٹر ہیں مثلاً انور کے کردار
میں غلو پایا جاتا ہے جو شاعری میں قابل معافی ہو ناول نگاری میں
مناسب نہیں۔ فیاض علی صاحب اگر اپنے زور قلم کو ناول کی کسی اور روش میں صرف
کریں تو بہت کامیابی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں اچھا لکھنے کی بڑی صلاحیت
موجود ہے۔

اُردو افسانہ اور شاعری کے رجحانات

(۱) ٹوٹے ہوئے دل - رام پرتاپ بہادر - ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس - الٰہ آباد

(۲) اوراقِ گل، مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی - پی سی ایس - رامپور

(۳) وسعتیں - سلام مچھلی شہری - مکتبہ اردو لاہور

اُردو میں افسانہ اب ایک مستقل صنفِ ادب ہوگیا ہے - ہمارے موجودہ لٹریچر کا کچھ بہترین حصہ افسانوی ادب ہی میں ملیگا - افسانوں کے موضوع جنسیات سیاسیات سماجی خلفشار، سرمایہ و محبت کی کشمکش وغیرہ ہیں جنسے زندگی کا براہ راست تعلق ہے اور جن کا زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے - ہمارے افسانہ نگاروں نے جنگ کا اثر بھی شاعروں سے زیادہ نہیں تو کم قبول نہیں کیا لیکن ہمارے یہاں روسی یا چینی جنگی افسانوی ادب کا پرتو نہیں ملتا - چونکہ جو حالات روس اور چین میں رونما ہوئے ان سے ہم دوچار نہیں ہوئے اسلئے ہمارے یہاں افسانہ زیادہ تر انگریزی اصولوں پر گامزن ہے - مثال کے طور پر کرشن چندر کا افسانہ "بالکونی" جو ۴۳ء میں شائع ہوا کو[illegible]فر ایشروڈ کے افسانہ "لوئس" کے طور پر ڈھالا گیا معلوم ہوتا ہے جو تقریباً ۹ سال پہلے شائع ہوا تھا - "نیو رائٹنگ" کے ایڈیٹر جان لیہمن کا خیال ہے کہ جنگ

نے انگلستان کے افسانوی ادب پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں ڈالا۔ یہ ہی حال ہمارے
یہاں ہے۔ اگرچہ بھوک، بیکاری اور اشیاء کی گرانی اور کمیابی کی طرف افسانہ نگاروں
نے توجہ کی ہے لیکن ایسے افسانے کم ہیں۔ ان میں بعض افسانہ ادبی حیثیت سے
اتنے بلند پایہ نہیں۔ چونکہ یہ افسانہ ایک خاص ہیجان کے ماتحت اور زیادہ تر جلدی
میں لکھے گئے انہیں وہ ادبی خوبیاں نہیں جو ہمارے بہترین افسانوں میں ملیں گی
پھر بھی ہمارے افسانوی ادب میں ان افسانوں سے قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

رام پرتاپ بہادر کے بارہ افسانوں کا ایک مجموعہ "ٹوٹے ہوئے دل" کے
نام سے ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ایک
طرف تو پریم چند کا پرتو ملتا ہے اور دوسری طرف افسانہ نگار نے موجودہ دور
کے اثرات کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ جہاں رام پرتاب بہادر دیہاتی زندگی
کی تصویریں کھینچتے ہیں وہاں وہ مکمل تصویریں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "گاؤں
کی لڑکی" اس قسم کی ایک کہانی ہے جس میں حسن و محبت کی دلفریبیوں کے ساتھ ساتھ
گاؤں کے ایک غریب کسان کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ دوسرا افسانہ "زرینہ" اگر
ناول ہوتا تو شاید اور بھی کامیاب ہوتا۔ اسمیں عورت کی انتہاء محبت کو جس دلدوز
انداز میں بیان کیا گیا ہے اسکی مثال رام پرتاب بہادر کے یہاں بھی کسی اور افسانہ
میں نہیں ملتی۔ ایک اور کہانی میں جس کا عنوان "شام" ہے جنسیات کے اقتصادی

پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے افسانہ نگار نے بتلایا ہے کہ طبقاتی کشمکش میں متوسط طبقہ نیست و نابود ہو کر رہ جائے گا۔ افسانہ نگار کی آنکھ سے سماج کا کوئی ناسور چھپا ہوا نہیں "پھلجھڑی" اور "ٹوٹے ہوئے دل" میں انھوں نے سماج کی حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔ غربت ناسمجھی، تعلیم کا فقدان، گانجے، چرس اور افیون کی برکتیں۔ ان سب پر نظر ڈالی ہے۔ بعض کہانیوں میں افسانوی عنصر کم اور خاکے کا عنصر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض افسانہ انگریزی کی مزاحیہ کہانیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ "زندگی کے جلوس" میں ایک حقیقت نگاری ہے جس کا اظہار آخر میں اس طرح ہوا ہے کہ "ہم سبھی چھوٹے بڑے کتنے ہیں اور باوجود ایک دوسرے کی خوشی یا ناخوشی کے ایک دوسرے کو منھ میں دبائے پھرتے ہیں"۔ "بتلا بچہ" کے خواب میں امارت اور غربت کے دو مرقعے پیش کئے ہیں۔ یہ سب افسانے پڑھنے کے قابل ہیں لیکن کنایاتی صناعی کا ایک بہترین نمونہ وہ افسانہ ہے جس کا عنوان ہے "کہیں فرانس میں"۔ اسکو پڑھتے وقت جرمنی کی ۱۹۴۰ء کی کشمکش کہ وہ مشرق کی طرف بڑھے یا مغرب کی طرف ذہن میں رکھنی لازمی ہے۔

رام پرتاب بہادر کی زبان میں یکسانیت نہیں۔ کہیں زبان بہت عمدہ ہے کہیں معمولی اور کہیں بالکل پیتی ہی۔ ہندی کے الفاظ جو عام طور پر اردو میں استعمال نہیں ہوتے کافی استعمال کئے گئے ہیں۔ اسکی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ یہ افسانہ ہندی میں اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کے شروع کے سولہ صفحوں اور آخر کے

بتیس صفحوں میں مصنف نے اُردو ہندی کے متعلق بہت دلچسپ بحث کی ہے جس کو پڑھ کر انکے غیر جانبدارانہ رویّہ کا ثبوت ملتا ہے۔

بزمِ سخن رامپور نے مختلف شعرا کو مختلف اوقات میں رامپور مدعو کیا۔ اُن کا کلام سنا اور اب ایک مجموعہ "اوراقِ گل" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اسمیں ۲۹ شعرا کے مختصر حالاتِ زندگی، عکسِ خط، شبیہ اور چیدہ کلام یکجا کئے گئے ہیں۔ وحشت، اثر، صفی، سائل و جلیل رامپور نہ جا سکے باقی جو بیس شعرا نے بزمِ سخن کو اپنے کلام سے محظوظ و مستفید ہونے کا موقعہ دیا۔ ان میں ایک طرف آرزو لکھنوی، آزاد انصاری مرحوم، بیخود دہلوی، ثاقب لکھنوی، ساحر دہلوی، نوح ناروی، سیماب اکبرآبادی اور حسرت موہانی ہیں اور ایک طرف اثر صہبائی، احسان دانش، اختر شیرانی، جگر مرادآبادی، روش صدیقی، رضا لکھنوی، ساغر نظامی نظر آتے ہیں۔ دربارِ رامپور سے مرزا غالب بھی فیض یاب ہوئے۔ انکے بعد داغ، امیر، تسلیم اور جلال پر یہ ابرِ کرم برسا اور عہدِ موجودہ میں شعرا کی قدردانی کی یہ مجموعہ بیّن دلیل ہے۔

اس مجموعہ کے لئے ہر شاعر سے مندرجہ ذیل سوالات بھی کئے گئے تھے:-

(۱) شاعر کے نزدیک شاعری کا کونسا پہلو اہم ہے، اقتصادی، معاشرتی یا روحانی۔

(۲) شاعر کی نظر میں اردو ادب کی خدمت کس نہج سے ہونا چاہئے؟
(۳) شاعر کی نظر میں ہندی، سنسکرت وغیرہ کے الفاظ کا شمول کس حد تک مناسب ہے؟
(۴) شعر کے لئے ردیف و قافیہ کی پابندی کہاں تک ضروری ہے؟
(۵) دوسرے شعرا کے چند منتخب اور پسندیدہ اشعار کونسے ہیں؟
(۶) نظم اور غزل میں کس کو بہتر اُستاد مانتے ہیں؟

زیادہ تر شعرا نے ان سوالات کے جوابات دئے ہیں، بعضوں نے سب سوالوں کے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ لیکن یہ سب جوابات تشنہ ہیں اور وضاحت چاہتے ہیں جس کی جگہ اس مجموعہ میں مشکل ہی سے نکل سکتی تھی۔ بہر حال ان جوابات سے شاعر کے رجحانات کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ یہ مجموعہ سب شاعروں کی تصویروں سے مزین ہے۔ بعض تصاویر خاص پر اس مجموعہ کے لئے لی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض اُوپر کو اُبھری اُبھری معلوم ہوتی ہیں جس کی ذمہ داری آرٹسٹ پر ہے۔

انتخاب سلیقہ اور کاوش سے کیا گیا ہے۔ جگر مرادآبادی، حسرت موہانی اور احسان دانش کا انتخاب بہت خوب ہے۔ حفیظ کے گیت ان کی غزلوں سے زیادہ رسیلے ہیں اسلئے ایک دو گیت اور ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ جوش کے انتخاب میں انکی نئی چیزوں کو شاید نہیں دیکھا گیا کیونکہ صرف ایسی نظمیں، غزلیں اور قطعات اس مجموعہ میں شامل

ہیں جو جوشؔ کے مشرب رندانہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ لیکن انکے انقلابی مسلک پر روشنی نہیں ڈالتے۔ ایک لحاظ سے یہ انتخاب جوشؔ کے بہترین کلام کی صحیح نمایندگی کرتا ہے کیونکہ جوشؔ جہاں اقبالؔ کے زیر اثر انقلابی شاعری کیطرف قدم اُٹھاتے ہیں تو انکے کلام میں شاعرانہ لطافتیں کم اور خطابت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

اوّل اوّل اقبالؔ پر رجعت پسندی اور فسطائیت کے لیبل لگانا چند خود ساختہ ترقی پسندوں کا خاص مشغلہ تھا۔ "بالِ جبریل" کو انھوں نے اس کتاب کے شائع ہونے پر کسی خاص نگاہ احترام سے نہیں دیکھا بلکہ اپنی رعونت اور تنگ نظری کی بنا پر جوشؔ کو اقبالؔ کے مقابلہ میں نقیب انقلاب بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس سلسلہ میں جوشؔ کا یہ کہنا کہ وہ نظم میں نظیرؔ اور اقبالؔ کو اُستاد مانتے ہیں اُنکے ذہنی توازن کی دلیل ہے۔ ویسے بھی وہ خود ساختہ ترقی پسند ادیب جو فسطائی قطعیت کے ساتھ ادب اور زندگی کے اُصولوں پر رائے زنی کرتے تھے اور اقبالؔ کو ایک عہد رفتہ کا شاعر بتلاتے تھے جسکی شاعری اور جس کا پیغام عہد حاضر کے لئے کوئی قابلِ قدر چیز نہ تھی۔ اب رفتہ رفتہ اپنی رائے بدل رہے ہیں اور اقبالؔ کو ترقی پسندی کا امام ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

پوری کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے لیکن اپنے ظاہری حسن کے علاوہ ایک اور لحاظ سے یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔ موجودہ دور کے شعرا کے رجحانات اس انتخاب میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ نئے اور پرانے شاعر سب ہی نے اُردو کے پھولوں کی

آبیاری کی ہے۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ عہدِ حاضر میں ساحر کی سادگی و روانی، فراق کے کلام کا تخیلی پہلو اور کیفی دہلوی کی روحانی اور اخلاقی شاعری قابلِ توجہ ہیں۔ مثال کے طور پر ساحر کا یہ شعر

کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہے کوئی　　اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

صفی کے اس شعر کے ہم مرتبہ ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا　　ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ساحر اپنی پیرانہ سالی میں بھی جس جوش و خلوص کے ساتھ مشاعرہ کرتے تھے وہ آپ اپنی نظیر تھا۔ آدابِ محفل کا بہت خیال رکھتے اور حاضرین پر انکی بزرگانہ محبت کا بڑا اثر پڑتا۔ مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے، استادوں کے سامنے مبتدیوں کی طرح بیٹھتے۔ افسوس وہ اب ہماری محفلوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے اور راجہ نرنیدرناتھ بھی جو ان کے یہاں اگر دہلی ہوتے تھے تو مشاعرہ کی صدارت کیا کرتے تھے۔

آزاد انصاری اور آرزو کی سادگی و پرکاری، اثر صہبائی کی چاشنیٔ غم، احسان دانش کی گلکاری، اختر شیرانی کی نغمگی، جگر کی سرشاری، جوش کی صناعی، حسرت کی رنگ آفرینی، حفیظ کے گیتوں کی چاشنی، سیماب اور صفی کی پختگی، نوح اور وحشت کی شوخی، سائل کی ولانتِ زبان، اثر کی فراوانیٔ جذبات کونسی چیز ایسی ہے جس کے بغیر

اُردو شاعری اپنا رنگ و روپ قائم رکھ سکتی ہے۔

نوحؔ، سائلؔ، ساقبؔ اور بیخودؔ، آرزوؔ و جلیلؔ غزل کے اُستاد ہیں۔ انھوں نے زبان کے سانچے بنائے۔ ان سانچوں میں نازک ترین احساسات کو بیان کیا۔ حسرتؔ اور جگرؔ نے زبان کو لطافتوں اور رنگینیوں سے مالا مال کیا۔ جوشؔ نے اپنا زمزمہ رندی سنایا، حفیظؔ نے سریلے گیت گائے۔ احسانؔ نے غمِ زندگی کی نقاشی کی۔ ان سب بحانات کو ہم اس مجموعہ کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

سلامؔ مچھلی شہری ہمارے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ انکا ایک مجموعہ کلام "میرے نغمے" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ اب مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہوا ہے [اس کو پچھلے مجموعہ کا تتمہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ پچھلے مجموعہ کے دو حصے تھے۔ ایک "پھول" اور دوسرا "انگارے"۔ پھول والا حصہ شائع ہو گیا لیکن انگارے والا حصہ ایک مبہم اعلان کے ساتھ کہ "سب کچھ ہو جانے اور پروف دیکھ لینے کے بعد ہمیں اچانک معلوم ہوا کہ کتاب نہیں شائع ہو سکتی" شائع نہیں کیا گیا۔ "انگارے" والے حصہ کی ۹۲ صفحہ کی فہرست "میرے نغمے" میں دی ہوئی ہے "وسعتیں" ۱۱۸ صفحہ کی کتاب ہے اور پہلی نظم صفحہ ۹ پر ملتی ہے "اسمیں ہاجرہ نئے "سٹرک بن رہی ہے" "مجھے وہ نظم لکھنی ہے"۔ وہ نظمیں ہیں جو "میرے نغمے" کی فہرست میں شامل تھیں اور

مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ معلوم نہیں پھر کیا امر "مرے نغمے" میں انکی اشاعت نہ کرنے کا باعث ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان کے وقت کہ "چاہئے ادب اور آرٹ کو زبان کھولنے کی اجازت ملی۔ ہم سلام مچھلی شہری کے تمام کلام کا مجموعہ شاندار طور پر پیش کرینگے"۔ درحقیقت دوسری کتاب کا خاکہ پیش نظر تھا ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز سنہ ۴۰ء یا سنہ ۴۱ء میں شائع نہیں ہوسکی تھی وہ سنہ ۴۴ء یا سنہ ۴۵ء میں کس طرح شائع ہوسکی جبکہ جنگ برابر جاری ہے اور ہندوستان پر اسکا اثر پہلے سے زیادہ پڑ رہا ہے۔ یہ "انگارے" ہماری نظروں سے رسائل میں گزر چکے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ انکی اشاعت، کتابی صورت میں اس وجہ سے نہ ہوسکی کہ یہ انقلابی بم ہیں اصلیت سے دور ہوگا۔ نہ جانے کتنا انقلابی ادب اس جنگ کے دوران میں شائع ہوا اور ہو رہا ہے۔ روسی ادب اور روسی ادیبوں سے جس طرح ہم ان دنوں بہرہ یاب ہوئے ہیں اس سے قبل نہیں ہوئے تھے۔ "سرخ سویرا" اور "جھنکار" جیسے مجموعے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں]

سلام صاحب کی کتاب کو میں نے اوّل سے آخر تک پڑھا۔ اسکے بعد اپنے چند احباب سے جو خود بھی ترقی پسند شاعر، مصنف یا نقّاد ہیں۔ تبادلۂ خیال کیا اس سے مجھے معلوم ہوا کہ میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ چنداں غلط نہیں یعنی سلام صاحب کی زیادہ تر نظموں میں نہ تو تعینِ مقصد ہے نہ روانی ہے، نہ وہ

گھلاوٹ جو شاعری کی جان ہے۔ نہ ان کو ابھی الفاظ پر مکمل قدرت حاصل ہے نہ وہ اپنا مطلب ہمیشہ واضح طور پر بیان کر سکتے ہیں، نہ آرٹ ہے، نہ ایسے خیالات ہیں جن کا شاعری کے ذریعہ عوام تک پہونچانا ضروری ہو۔ مثال کے طور پر انھوں نے "ادب برائے حیات" اور "ادب برائے ادب" پر بحث سنی اور فوراً ایک قطعہ لکھ دیا جس کی سرخی ہے "نقادوں سے" اگرچہ قطعہ میں صرف "ناقد زبان و ادب" سے ہی تخاطب ہے لیکن اس قطعہ میں سوائے اس اعلان کے کہ

تو پھر ادب میں ابھی انقلاب کی خاطر
کہاں ہے وسعتِ پابندئ قیود و نکات

جس کو انھوں نے اپنی بے رنگ نظموں کے لئے اعلان جواز سمجھ لیا اور کچھ نہیں۔ ترقی پسند نقاد خود اس نظریہ کی تردید کر چکے ہیں۔ ادب میں انقلاب کیلئے زنگ آلود یا کچے ہتھیار استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

اس مجموعہ میں بعض نظمیں مثلاً "مجھے وہ نظم لکھنی ہے" "سات رنگ" "پناہ" اچھی نظمیں ہیں اور اگر ایسی ہی نظمیں اور ہوتیں تو ہمارے نوجوان شعرا میں سلام کا پایہ بہت بلند ہوتا لیکن ایسی نظمیں بھی ہیں جیسے "مال روڈ لکھنؤ" اور "نکی بٹ لکھنؤ" جو بالکل سطحی ہیں اور کسی بندی کی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں سلامؔ پر موجودہ شاعروں میں میراجی اور فیضؔ کا اثر پڑا ہے لیکن انکے یہاں

میراجی کا ابہام بھی نہیں جو شعر کی کمزوریوں پر نقاب ڈال سکے، نہ فیض کی رفعت تخیل ہے۔ انکی نظم "زرد چراغ" جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

گل کرو پھینکدو پہلے ہی سے یہ زرد چراغ

آج ہی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہیں

جس میں فیض کا انداز جھلکتا ہے آگے چلکر ایسے چشمہ کی طرح جو صحرا میں خشک ہو جائے۔ مدغم ہوکر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "اندیشہ" جو میراجی کے مبہم انداز میں لکھی گئی ہے میراجی کی زیادہ تر نظموں کی طرح اپنے ہی گورکھ دھندے میں کھو جاتی ہے احسان دانش کے رنگ میں غمگین زندگی کی نقاشی ایک نظم میں کی گئی ہے، جس کا عنوان ہے "باجرہ سے" اسمیں وہ انگارے تو نہیں دہکتے جو احسان کی شاعرانہ نقاشی کو روشن کرتے ہیں لیکن چنگاریاں ضرور سلگتی ہوئی معلوم پڑتی ہیں۔ زندگی کے تندو تیز دھارے کو اتنی فرصت کہاں کہ بقول سلام صاحب جہاں کے الم رسیدہ نظام کے تبدیل ہونے کا انتظار کر سکے۔

ٹکنیک کے بھی سلام نے تجربہ کئے ہیں۔ اسمیں وہ بالکل ناکامیاب بھی نہیں لیکن انکے یہاں وہ ناپختگی کا اعلان ضرور ہیں۔ کہاں راشد کا زور بیان اور شوکت الفاظ اور کہاں سلام کی بنگال کی رقاصہ والی نظم جو بالکل بے آب اور پھیکی ہے۔ سلام نغموں اور جھنکاروں کے شاعر ہیں۔ یہ ہی انکے کلام میں جہاں جہاں

نظر آتی ہے اسکی ذمہ دار ہے، وہ ان آوازوں کو سمجھنے بھی نہیں پاتے کہ نظم لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی نظمیں پیش کرتے ہیں جو نامکمل ہوتی ہیں جن میں سطحی تخیل کے سوا کچھ نہیں ہوتا جن میں شاعری کا رچاؤ نہیں ملتا۔ "ادب برائے حیات" میں تو خاص طور پر وہی دلکشی ہونی چاہئے جو حیات نو کے تخیل میں ہے۔ سلام کی نظموں میں جدید رجحانات کا پرتو ملتا ہے لیکن انھیں ابھی آرٹ اور ہلکے پروپاگنڈے میں تمیز کرنا سیکھنا ہے تاکہ انکی نظموں میں کھردرے پن کے بجائے دلکشی اور سطحی جذبات کے بجائے گہرائی پیدا ہو سکے۔

[سلام کی شاعری تجرباتی شاعری ہے اس مجموعہ کے شائع ہونیکے بعد انکی چند اور نظمیں ادھر اُدھر چھپی ہیں۔ یہ نظمیں رعنائی تخیل اور لطف زبان کے لحاظ سے اس مجموعہ کی بہت سی نظموں سے بلند ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو نظمیں انھوں نے غور و خوض سے کہی ہیں وہ کامیاب ہیں۔ انکے ہم پلہ شاعروں کے کلام سے موازنہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلام کا کلام اپنے گروپ کے شاعروں میں کسی اور شاعر کے کلام سے کم درجہ نہیں رکھتا۔ غور و فکر کی مدد سے انکی شخصیت کے نقوش زیادہ اجاگر ہو سکیں گے اور انکی نظموں میں زیادہ شیرینی گداز اور اثر آفرینی پیدا ہو سکے گی]

[یہ حصہ نشر کے بعد اضافہ کیا گیا]

. . . .

ہے

احسان دانش

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی

لیکن یہ غوغائے رستاخیز یہ گردش کی تیزی آخر کیوں اور کس طرح؟ یہ ہمارے ادب میں کس طرح داخل ہوئی، ہماری زندگی کے تبدیل ہو جانے سے یا خارجی اسباب کی بنا پر غدر سے پہلے اُردو شاعری کی دنیا میں ناسخ اور ذوق کا سکہ رواں تھا۔ مضمون آفرینی اور لفظی صنعتیں اُردو شاعری کی پونجی بنی ہوئی تھیں۔ کیا نیا مضمون پیدا کیا ہے، کیسا مضبوط شعر کہا ہے، کیا صنعت ہے، اس قسم کی داد پر شاعر پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک تالاب میں سب لوگ جمع تھے، اسی پانی سے غسل کرتے تھے اور اسی پانی کو پیتے تھے لیکن مطمئن تھے اور اپنی شاعری پر نازاں۔ غدر کے بعد زمانہ پلٹا زمین اور آسمان دونوں نئے روپ میں نظر آنے لگے۔ سماج کا رنگ بدلا۔ گھر گھر اس زلزلہ کا اثر محسوس ہوا۔ کچھ لوگ ماتم میں مبتلا ہو گئے کچھ لوگ کمر باندھ کر تعمیر کی طرف رجوع ہوئے۔

اب غالب اقلیم سخن میں نغمہ سنج تھے انھوں نے پُرانی محفلیں بھی دیکھی تھیں

اور پرانی محفلوں کی بربادی بھی انھوں نے یاس انگیز فلسفیانہ خیالات کو جو اُنکے گردو پیش تھے شاعری میں جذب کرلیا۔ جدّتِ خیال اور جدّتِ الفاظ سے اُردو کے دامن کو خوشنما بنایا لیکن انکی شاعری کشمکش حیات کے طوفان سے تنگ آکر فلسفیانہ بیخودی کی طرف راغب ہوئی۔ اسمیں ان کو تسکین ملی۔ بیخودی کی افیون بندِ غم سے انسان کو کچھ عرصہ کے لئے تو آزاد کر ہی دیتی ہے۔ یہ دور بھی ختم ہوا داغ نے ایک بڑے سرکل سے اپیل کی انھوں نے زندگی کی شورش کو مے و مینا رندی و سرشاری، رنگینی و شوخی سے خوشگوار بنانا چاہا۔ وہ زندگی کو یہ کہہ کر بہلایا کئے کہ

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

کسی نے تعریف تو پھر اور دل کے داغ دکھانے لگے کہ

کیجئے گا قتل ہم کو تو قرباں جائینگے
پر سر کے ساتھ آپ کے احساں جائینگے
ہر چند آج کل سے زیادہ ہے سادگی
تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ مہماں جائینگے

حالی نے اس فضا میں آنکھ کھولی۔ اب وہ سرزیرِ بارِ منت دربان کئے ہوئے

زمانہ گذر چکا تھا لیکن دل کی بیتابی کا کوئی علاج نہ بیخودی کی افیون کرسکی نہ وعدۂ فردا۔ اب خودداری کی نشوونما کی ضرورت محسوس ہوئی گردوپیش کا جائزہ لینے کی اہمیت ظاہر ہونے لگی۔ چنانچہ جو شاعری کو ہوش آیا تو درد کی وجوہات پر غور ہونے لگا سماج کے مرض کی تشخیص کی کوشش ہونے لگی۔ شاعری اس دور سے بھی گذرتی رہی یہانتک

نعرۂ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

ایک سحر کا شاعر آ پہونچا اور اس نے اعلان کیا کہ

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں ہے

اُن لوگوں کا زمانہ ختم ہوا جو

چشم آدم سے چھپاتے تھے مقامات بلند
کرتے تھے روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

شاعری کے ذریعہ فکر انسانی بلند ہونے لگی۔ اقبال نے ایک آتش خاموش سے آنچ دیکر اس کو کندن کردیا، اس کا روپ بدل دیا، شاعری زندگی کی نئی شاہراہوں پر چلنے لگی ہر طرف نئے نغمے سنائی دینے لگے، نئے پیغام نئے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نشوونما پانے لگے (یعنی تحریکات و رجحانات کی ایک پیداوار اور اس ہی بہار کا

ایک خوشنما پھول احسان دانش ہیں۔

احسان نے مصائب زمانہ کے الم انگیز پہلو کو جس طرح روشن کیا ہے وہ ابتک ہماری شاعری میں نہیں کیا گیا تھا۔ انکے یہاں سانس کی جگہ آنسو، دل کی جگہ جذبات نے لے لی ہے۔ وہ افلاس، بیچارگی، کرب و درد، ناداری و مجبوری کے رخ سے اس طرح نقاب اٹھاتے ہیں کہ دل سے چیخ نکل جاتی ہے۔ ایک طرح یہ میر اور فانی کے خاندان سے ہیں لیکن میر اور فانی یاس کو ایک جنتی عطیہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور احسان زندگی کے مصائب سے مقابلہ کرکے اس کو رنگین اور خوشگوار بنانا چاہتے ہیں۔ میر اور فانی نے موت کو زندگی سے زیادہ خوشنما بنا کر پیش کیا ہے۔ احسان موت کی ایک بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس تصویر کے خط و خال نمایاں کرتے ہیں اور پھر فکر انسانی کو دعوت دیتے ہیں کہ آب حیات کی تلاش کرے، تریاق کا پتہ لگائے اور شورش حیات پر غلبہ حاصل کرے۔ اس راہ میں مشکلات بھی ہیں لیکن

یہ کفر کا فتویٰ شاعر کی فطرت پہ اثر کیا ڈالیگا
ایسے تو بہت الفاظ یہاں ہر وقت تراشے جاتے ہیں

ان کا نظریہ یہ ہے کہ

علم اک تاب و تواں ہے زندگی کیواسطے
زندگی کے واسطے پائندگی کے واسطے

علم کے بل پہ انوکھی چال چل سکتا ہے مرد
خارزاروں کو گلستاں میں بدل سکتا ہے مرد

اور اُنکا مخاطب وہ طبقہ ہے جس کے افراد نے

دھجیوں کو ہمنشینوں سے چھپانے کے لئے
آستینیں اُلٹ رکھی ہیں بہانے کے لئے

وہ فطرت انسان کو ظلم و کینہ پروری، سفاکی و سفلگی سے دور رکھنا چاہتے ہیں
اُن کے پیغامِ عمل میں صداقت کو بہت بڑی جگہ حاصل ہے شرط یہ ہے کہ

دل پہ ہر دم نشۂ معصومیت طاری رہے
نیش کاوش میں صداقت کا لہو جاری رہے

یہ اُن کا عقیدہ ہے کہ

عرشِ اعظم ہے فغانِ بیکساں سے متصل
قدسیوں کا ان کی خاموشی پہ بھر آتا ہے دل

لیکن جب وہ انتظار کرتے کرتے بیچین ہو جاتے ہیں تو یوں بھی چیخ اُٹھتے ہیں

جیوں خدا کے کرم کی اُمید پہ کب تک
حیات کو بھی قدم گیر کر دیا تو نے

اور پھر اقبال کی نرالی شوخی کے انداز میں کہتے ہیں کہ

جہاں میں مفلسی کس کی خوش اندیشی سے ہے یارب
یہ خلاقی تو آساں ہے مگر مشکل ہے رزاقی

پھر بھی وہ بیدینی اور بے یقینی کی راہ پر انسان کو نہیں ڈالتے کہتے ہیں

خدا کو پا نہیں سکتا خدا کی ذات کا منکر
نہ جبتک دل سے نقص ناتمامی دور ہو جائے
خدا وہ ہے کہ جس کی عظمت و جبروت کے آگے
خود انساں سجدہ کرنے کے لئے مجبور ہو جائے

درحقیقت یہی امتزاج یہی اعتدال ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ "فسون بہار" اور "سادھو کی چتا" دونوں اُن پر اپنا اثر کرتے ہیں۔ اُنکا دل ایک آئینہ ہے جس پر ہر احساس اپنا نقش صاف صاف ڈالتا ہے اور پھر وہ نقش ان کی شاعری میں منعکس ہو جاتا ہے۔ "بیوہ" "نوعروس بیوہ" اور "جشن بیچارگی" میں وہ جس شدت سے غم کے نقوش پیش کرتے ہیں، اسکی مثال اُردو شاعری میں کم ملتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی مردانگی، بلند نظری، اعلیٰ ظرفی اور جرأت انکے کلام میں ایک مجاہدانہ شان پیدا کر دیتی ہے، مثلاً وہ سنگ ساز مذہبی پیشواؤں کی تصویر کھینچتے ہیں۔

دے کے جل دنیا کو اپنی فطرتِ ناپاک سے
وہ بنا لیتے تھے سونا مقبروں کی خاک سے

انکے ایمانوں میں رخنے تھے وفا میں داغ تھے
دل تھا ناقص دامنِ صدق و صفا میں داغ تھے
خانقاہوں میں دلوں کا مدعا بکتا رہا
مدتوں انکی دوکانوں میں خدا بکتا رہا

ایسی حالت میں وہ مکر و فریب کے خلاف جہاد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اب تمہارا یہ طلسم ہاؤ ہو توڑوں گا میں
رازہائے خرقہ پوشی کھول کر چھوڑوں گا میں

میں احسان کی شاعری کے ارتقائی منازل سے ابتک اس کا مطالعہ کرتا رہا ہوں "حدیث ادب" اور "دردِ زندگی" پر میں نے جنوری ۱۹۳۵ء میں ایسٹرن ٹائمز لاہور میں ریویو کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ابھی ان کو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوئی اور وہ اپنا مطلب بھی بعض مرتبہ صاف صاف نہیں بیان کر سکتے۔ اس عرصہ میں انکے شاعرانہ شعور نے جو نشو و نما پائی اُس کا ان دو قطعوں سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب کسی کی یاد آکر تلملا جاتا ہے دل　　جگمگا اُٹھتی ہے کچھ اس حال سے بزمِ دماغ
جیسے ساون کی اندھیری رات میں اک نازنیں　　صحن میں زینے سے اُترے ہاتھ میں لیکر چراغ

یہ شبِ مہتاب یہ کشمیر میں ڈل کا سماں　　پڑ رہا ہے پُرسکوں پانی میں عکسِ کوہسار
جیسے اک بیدین کے دل میں زبانِ زندگی کے بعد　　منعکس ہوتی ہے اکثر عظمتِ پروردگار

ان قطعات میں انکا مفہوم حدود سے آزاد ہے اور بے پایاں وسعت اختیار کر گیا ہے۔ چار چار مصرعوں میں انھوں نے جس لطافت سے یہ تشبیہیں پیش کی ہیں وہ انکی قدرت کا پتہ دیتی ہے۔ اب الفاظ انکے غلام نظر آتے ہیں۔ تنگنائے غزل کو انھوں نے چھوڑا نہیں بلکہ اپنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں بلندی، سوز، سرور بھرا ہے کہتے ہیں

نقاب دیدۂ خود بیں سے جب سرکتا ہے　　ہر ایک چیز میں حسنِ ازل جھلکتا ہے
نہیں ہے جذب اگر مجھ میں جلوۂ جاناں　　زمانہ کس لئے صورت کو مری تکتا ہے
ہماری چشم تحیر کے دیکھنے والے　　ٹھہر ٹھہر کہ یہ ساغر ابھی چھلکتا ہے
چمن میں بادِ صبا کی سبک خرامی سے　　ہر ایک قطرۂ شبنم کا دل دھڑکتا ہے

اور

سینے کے داغ دل کو درخشاں نہ کر سکے
لاکھوں چراغ گھر میں چراغاں نہ کر سکے
سازِ طرب نشاطِ بہار و شبابِ گل
میرے سکوتِ غم کو غزلخواں نہ کر سکے
تیری نظر کے فیض سے ان مشکلوں میں ہوں
جن مشکلوں کو تو بھی اب آساں نہ کر سکے

ایک اور لطیف شعر ہے

تو مل گیا کہ ڈھونڈھنے والے نہیں رہے
ہنگامہ کیوں وہ اب سرِ محفل نہیں رہا

انکے مذہب شاعری میں جو وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ بھی قابل نشستہ رہے
کہتے ہیں

حقیقت در حقیقت بتکدہ میں ہے نہ کعبہ میں
نگاہِ شوق دھوکا دے رہی ہے رہنما ہو کر
مرے سجدوں کی یارب ناتمامی کیوں نہیں جاتی
یہ کیا ہے اعتنائی اپنے بندے سے خدا ہو کر

اور

مذاقِ عاشقی ہیں قائلِ دیر و حرم رہنا
اسی کو درحقیقت خامیِ ایماں بھی کہتے ہیں

حسرت موہانی کے انداز میں حضرت سری کرشن کی بارگاہ میں چند شعر نذر
کرتے ہیں

سُن اے مرلی منوہر جانِ جاں تصویرِ زیبائی   جگت موہن ہے تو منموہنی ہے تیری رعنائی
تری ہنسی کی تابانیں مضطرب بھگتوں کے سینوں میں   ترے دم سے ضیا پاشی دلوں کے آبگینوں میں
تری تابانیاں ہیں صبح کے تابندہ اختر میں   تری نیرنگیاں ہیں شام کی زلفِ معنبر میں

ترے داغِ سینہ سے سرخرو گلشن میں لالہ ہے ترے افکار سے باطن کی محفل میں اُجالا ہے
تو وہ شے ہے زمانہ تجھ سے غافل رہ نہیں سکتا تو وہ دولت ہے جسکو قلب فطرت کھو نہیں سکتا

احسان کی منظر نگاری انکے جذبۂ صداقت، قوتِ مشاہدہ، تہ نشین نظر، نزاکت احساس، نکتہ رس ذہن اور حیات و کائنات کی نقاشی نے اُردو شاعری میں ایسے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں اور ایسے بے بہا نقش تراشے ہیں جو ہمارے ادب کا سرمایہ قرار دئے جا سکتے ہیں — ابھی ان سے بہت اُمیدیں وابستہ ہیں کیونکہ انکی شاعری کا اصلی شباب ابھی آنے کو ہے جب

آملیں گے سینہ چاکاں چمن سے سینہ چاک
بادگل کی ہمنفس بادِ صبا ہو جائے گی

راحت کدہ*

راحت کدہ حضرت اثر صہبائی کے اس کلام پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنی جواں مرگ رفیقہ حیات کی موت سے متاثر ہو کر مختلف اوقات میں لکھا۔

سکینہ راحت صہبائی نے زندگی کی بیس بہاریں دیکھیں اور اپنی دو یادگاریں چھوڑ کر دنیا سے مئی ۱۹۳۱ء میں سفر آخرت کیا۔ صہبائی نے بمشکل چار بہاریں اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ گزاریں اور بس پیام اجل آ پہونچا اور ان کی حیات کا یہ افسانہ ختم ہوگیا۔ صہبائی کے دل پر اس سانحہ سے جو آفتیں ٹوٹ پڑیں۔ اسکا اندازہ کچھ انکے اس کلام سے ہوتا ہے جو انھوں نے راحت کدہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کلام انکو خاص طور پر محبوب ہے۔ اسمیں ان کی نظمیں۔ غزلیں اور وہ قطعات ہیں جو اس غم کی چھاؤں میں لکھے گئے۔

کلام کے کافی حصہ میں شیون و ماتم کی شعلہ ریزی ہے۔ ایک طوفان اضطراب ہے جو اشعار کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے ایک تیز دھارا ہے جس میں سے غم کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں آتی۔ رفتہ رفتہ یہ طوفان سکون پذیر ہوتا معلوم پڑتا ہے۔

*[مصنفہ حضرت اثر صہبائی ایڈوکیٹ جموں]

غم ہے لیکن اسمیں سکون کی چاشنی شامل ہوگئی ہے۔ شاعر جو لکھتا ہے اسمیں ایک آفاقی رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ غم اپنا ہی غم نہیں رہتا۔ بلکہ ایک ہمہ گیر صورت اختیار کرتا ہے۔ اس رنگ میں جو لکھا گیا ہے وہ ہماری شاعری میں ایک اضافہ ہے۔

ایک محبوبہ جو رفیقہ حیات بھی ہو۔ اس کی جدائی کسی اُردو شاعر کے دل و دماغ میں وہ موجیں نہ پیدا کر سکی۔ جو راحت کی موت نے صہبائی کے دل میں شدت کے ساتھ پیدا کیں۔ یہاں یا تو اپنی رفیقہ حیات کیلئے کچھ لکھا ہی نہیں گیا اور اگر لکھا گیا تو ایک آدھ غزل اس قسم کی زندگی اک ساز بے آواز ہے تیرے بغیر اور اس کے بعد پھر کسی محبوبہ نو وارد کے رُخ و گیسو کے قصیدے لکھے جانے لگے۔

صہبائی ہی ایک ایسا شاعر ہے جو برابر یہ ہی کہتا ہے۔

مجھ کو محبوب رہا تیری ہی تربت کا طواف۔

اس غم کی دنیا میں صہبائی کبھی فلسفہ کے دفتر چھانتا ہے۔ کبھی دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا ہے۔ کبھی غم کی حقیقت تلاش کرتا ہے۔ کبھی طلسم زندگانی کے تار و پود بکھیر کر معلوم کرنا چاہتا ہے کہ یہ طلسم کیا ہے۔ آخر کار شاعر وہاں پہونچتا ہے جہاں اسکا دل پکار اُٹھتا ہے۔

یہ گرفسوں گری ہے، یہ طلسم زندگی ہے
نہ خوشی نہ بے دلی ہے نہ الم نہ شادمانی

DUE DATE

ص۲۲ ۸۹۱۶۲۳۵

(۱۰ ب)

۳۲۸۵۹

Date	No.	Date	No.